علمی، ادبی، دینی، وتبلیغی رسالہ

ماہنامہ

اذان بلال

آگرہ

جلد ۳۸

شمارہ: ۵،۶

شوال المکرّم، ذی قعدہ ۱۴۴۷ھ مطابق مئی، جون ۲۰۲۶ء

مدیر: جناب مولانا قاری سعید احمد صاحب مرکزی

بیادگار

حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہیؒ

حضرت مولانا ابوالبرکات صاحب مظاہریؒ

بانی دارالعلوم آگرہ

سرپرست: حضرت مولانا بلال عبدالحی حسنی

موبائل نمبر: 9557358285

9411401142

فون: ۰۵۶۲_۲۵۲۰۷۴۸

زرتعاون ہندوستان سے

فی شمارہ............۲۵/روپے

سالانہ.........۲۵۰/روپے

خصوصی........۲۰۰۰/روپے

سہ سالہ.........۷۵۰/روپے

لائف ممبری....۱۰۰۰۰/روپے

بیرون ممالک

۵۰/امریکی ڈالر کے مساوی

مجلس ادارت

اساتذۂ دارالعلوم آگرہ

اس دائرہ میں سرخ نشان علامت ہے کہ آپ کی مدتِ خریداری ختم ہوگئی، آئندہ کے لئے براہِ کرم رقم ارسال فرمادیں

خط وکتابت کا پتہ: مینیجر ''اذان بلال'' دارالعلوم آگرہ محلّہ پیر جیلانی آگرہ۔۴

اس شمارے میں

نمبر شمار	فہرست مضامین	مضمون نگار	صفحہ

۱	خلافت تجوید	حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ	۵
۲	شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ......	حضرت مولانا ابوالحسن علی میاں ندویؒ	۱۶
۳	پاکی اور صفائی	حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب	۳۱
۴	اجتماعی زندگی کی وحدتیں......	حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ	۳۷
۵	فقہ وفتاویٰ	حضرت مولانا مفتی احمد صاحب خانپوری	۴۲
۶	محنت وریاضت	حضرت مولانا پیر ذوالفقار نقشبندی	۴۹
	خبرنامہ	ادارہ	۵۸

Printed at : Rabbani Printers Katra Sheikh Chand Lal Kuan Delhi.110006
Published by:Saeed Ahmad Markazi Darul Uloom Agra Peer Jilani Agra-4.

مضمون نگار کی ہر بات سے ادارہ ''اذان بلال'' کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ ادارہ

پرنٹر پبلیشر سعید احمد مرکزی نے ربانی پرنٹرس کٹرہ شیخ چاند لال کنواں دہلی سے چھپوا کر ''دفتر اذان بلال'' دارالعلوم آگرہ محلّہ پیر جیلانی آگرہ نمبر۔۴۔ یوپی (انڈیا) سے شائع کیا۔

قسط آخر

خلافتِ تجوید

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ

سندِ قرآن پر از روئے قرآن بحث

اسی واسطے ایک جگہ قرآن کریم میں اس کی سند بیان کی گئی ہے۔ جیسا کہ محدثین کوئی حدیث بیان کریں تو راویوں کے اوپر نقد و تبصرہ کرتے ہیں کہ اس کے راوی کیسے ہیں؟ پہنچانے والے کیسے ہیں جس درجہ کا راوی ہوگا اسی درجے کی روایت ہوگی۔ تو ایک سورت میں مستقل طور پر قرآن کریم کی سند پر بحث کی گئی ہے۔ فرمایا گیا:

انه لقول رسول کریم. ذی قوة عند ذی العرش مکین. مطاع ثم امین

گویا راویٔ اول جبریل علیہ السلام ہیں۔ اس لیے ان کا وصف بیان کیا گیا۔ چناں چہ فرمایا گیا:

انه لقول رسول کریم

یہ کہا ہوا ہے ایک رسول کا جو کریم ہے۔ تو لفظ رسول سے تعبیر کیا گیا۔ ظاہر ہے کہ رسول کس کے ہیں؟ اللہ ہی کے رسول ہیں۔ اللہ ہی تعبیر فرما رہے ہیں۔ ہر شخص اپنا رسول اور قاصد اسے بناتا ہے جس پر پورا اطمینان ہو۔ اگر ذرا بھی بے اعتمادی ہو اسے قاصد نہیں بنایا جاسکتا۔ معمولی معمولی باتوں پر اسے قاصد بناتے ہیں جس پر پورا اطمینان ہو، وہ دوستوں میں شمار ہوتا ہو، دشمن اور بدخواہ نہ ہو، سچا ہو، امانت دار ہو۔ تو اول تو لفظ رسول سے حضرت جبریل کی تعریف کی گئی کہ وہ ہمارے رسول ہیں، رسالت خود ایک بزرگی اور برگزیدگی کی چیز ہے۔

اس کے بعد فرمایا کہ رسول بھی کیسے ہیں؟ کریم ہیں۔

جن کے اخلاق میں کرم داخل ہے۔ان کی عادت میں کرم داخل ہے۔تو رسول بھی ہیں اور کریم بھی ہیں۔ کریم النفسی ان کا جوہر ہے۔تو دو لفظ فرمائے گئے۔ ایک رسول اور ایک کریم۔ جس سے گویا جبریل علیہ السلام کی شان واضح کی گئی۔

لیکن یہ سوال ہوسکتا تھا ایک شخص رسول بھی ہے۔ کریم بھی ہے، نیک نفس ہے۔ بالکل نیک نیت ہے۔ مگر اتنا کمزور ہے کہ اگر کلام لے کر آئے تو کسی نے دباؤ ڈالا، تو ممکن ہے کہ دباؤ میں بات بدل ڈالے، دباؤ میں آ کر مرعوب ہو جائے۔ تو نیک نیت بھی ہے، امانت دار بھی ہے مگر دل کا کمزور ہے۔ سچی بات کہنے لگا تھا مگر دوسرے نے تلوار دکھلائی کہ کیا کہتا ہے؟ دباؤ میں آ کر اس نے کچھ کا کچھ کہہ دیا۔ تو بعض دفعہ ایک شخص نیک نیت ہے، کریم النفس بھی ہے۔ مگر بے حد کمزور ہے۔ اندیشہ ہوتا ہے کہ شاید دب کر کلام میں تبدیلی کر دے۔ اس لیے ایک جملہ اور فرمایا۔

ذی قــوــۃ۔ رسول بھی ہے، کریم بھی ہے طاقت ور ہے۔ کمزور اور ضعیف نہیں ہے کہ کوئی اس پر دباؤ ڈال کر کچھ کا کچھ کہلوائے۔ بہر حال تین باتیں ہوئیں کہ جبریل میں رسالت بھی ہے، کرامت بھی ہے اور قوت بھی ہے۔ جبریل ایسے نہیں ہیں کہ کسی کے دباؤ میں آ کر کچھ کا کچھ کہہ دیں۔ سنجیدگی سے کہیں گے، امانت سے کہیں گے اور جو پیغام دیا گیا ہے وہی پہنچائیں گے۔

لیکن پھر بھی ایک احتمال ہوسکتا تھا کہ ایک شخص نیک نیت بھی ہے کریم النفس بھی اور با قوت بھی ہے۔ لیکن اس نے دور سے کلام کو سنا اور کچھ کا کچھ سن لیا۔ جب روایت کی تو پوری طرح وہ روایت نہ کر سکا جو اصل متکلم کا کلام تھا۔ اس نے میل دو میل، فرلانگ دو فرلانگ سے سنا۔ آواز آ رہی تھی مگر دور کی آواز تو دور کی ہوتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ غلط فہمی ہو جائے آواز پوری طرح کان میں نہ پڑے۔ یہ ایک احتمال ہوسکتا تھا۔ اس واسطے ایک جملہ اور بڑھایا

عند ذی العرش مکین

جبریل عرش والے کے پاس ہی رہتے ہیں۔کہیں دوری اور بعد نہیں ہے، یہ ممکن نہیں ہے کہ دور بیٹھ کر کچھ کا کچھ سن لیں۔تو قرب بھی انتہائی ہے کہ ان کا مکان اور جگہ اور رتبہ بھی عرش والے کے پاس ہے۔جیسا کہ حدیث میں ارشاد فرمایا گیا کہ جبریل علیہ السلام کا مقام سدرۃ المنتہی ہے۔اور یہ ساتویں آسمان کے اوپر ہے۔سدرہ کے آگے پھر جنتوں کے علاقے شروع ہوتے ہیں۔پھر اس کے اوپر سمندر ہے جس کے اوپر عرش عظیم واقع ہے۔بہرحال کائنات کا دائرہ جس کو مکلّف کہا جاتا ہے وہ آسمانوں کے نیچے نیچے ہے۔تو آسمانوں کے اوپر جا کر حضرت جبریل کا مقام ہے۔اب پرواز اگر ہوتی ہوگی تو کہیں اوپر ہی ہوتی ہوگی۔نیچے بھی آتے ہیں اور اوپر بھی جاتے ہیں۔اس لیے فرمایا گیا کہ **عند ذی العرش مکین**۔عرش والے ہی کے پاس مقیم ہیں لہذا دوری اور بعد کا کوئی سوال نہیں۔تو ایک راوی کی یہ شان نکلی کہ اس میں رسالت بھی ہے، کرامت بھی ہے۔قوت بھی اور قرب خداوندی بھی ہے۔بعد کا کوئی احتمال نہیں ہے۔

مگر پھر بھی ایک احتمال ہوسکتا تھا کہ ایک شخص رسول ہے، کریم ہے، طاقت ور ہے، اللہ کا مقرب بھی ہے۔لیکن اس کی کوئی حیثیت نہیں۔یعنی اس کا منصب کوئی نہیں۔منصب والا جب بولتا ہے، اس کی طرف توجہ کی جاتی ہے۔ایک بڑے سے بڑا آدمی ہو طاقت ور بھی ہو مگر اس کے پاس کوئی عہدہ نہ ہو، کوئی ضابطے کی بڑائی اس کے پاس نہ ہو، تو اس کے کلام کو توجہ سے نہیں سنا جائے گا۔اگر میں ایک جملہ بولوں اس کی کوئی وقعت نہیں ہوگی۔لیکن اگر کسی ملک کا سربراہ وہی جملہ بولے، تو سیاست کی بساط الٹتی چلی جاتی ہے۔اس کے معنی ہوتے ہیں، ملکوں میں اس سے انقلابات واقع ہوجاتے ہیں۔اس لیے کہ ایک صاحب منصب نے کلام کیا۔تو آدمی نیک بھی ہے بزرگ بھی ہے، مقرب خداوندی بھی ہے، حقانی بھی ہے۔مگر منصب دار اور عہدہ دار نہیں، کوئی منصبی رتبہ نہیں ہے، تو اس کا کلام زیادہ قابل توجہ نہیں ہوتا۔تو جبریل علیہ السلام کے متعلق

ممکن تھا کوئی یہ کہتا کہ بڑے درویش ہیں۔ بڑے اعلیٰ درجہ کے مقرب ہیں عرش کے قریب رہتے ہیں۔ نیک بھی اور بزرگ بھی ہیں کامل امانت دار ہیں مگر عہدہ وغیرہ تو ہے نہیں۔ اس لیے ان کی ذمہ دارانہ شان نہیں ہے۔ کہ ان کے کلام کو توجہ سے ہی سنا جائے اس لیے حق تعالیٰ نے ایک جملہ اور بڑھایا۔

مطاع

سارے ملائکہ کے سردار بھی ہیں اور واجب الاطاعات ہیں۔ سارے فرشتے ان کے آگے جھکے ہوئے ہیں۔ آسمانوں میں ان کی حکومت ہے سید الملائکہ ہیں تو ظاہر بات ہے جب متکلم، قاصد اور بولنے والا اپنی ذات سے تو بزرگ ہو، صاحب امانت ہو، باہر سے اس کو رسالت ملی ہوئی ہو، اور اوپر سے اتنا بڑا عہدہ دار کہ ساتوں آسمانوں میں اس کی حکمرانی بھی ہو، اس کی ذمہ داری اور اس کا منصب بھی ہو، تو اتنی بڑی شخصیت جب پیام پہنچائے گی تو اس میں کوئی دغل وفصل کا خطرہ نہیں ہوسکتا۔ کسی قسم کا کوئی اندیشہ نہیں ہوسکتا۔ اس کے بعد پھر فرمایا۔

ثم امین

ان سارے اوصاف کے اوپر یہ ہے کہ وہ امانت دار ہیں۔

اور اس کی شہادت کون دے رہا ہے؟

اللہ میاں شہادت دے رہے ہیں۔ یہ جبریل کو کون کہہ رہا ہے کہ وہ بزرگ بھی ہیں مطاع بھی ہیں۔ صاحب قرآن کہہ رہے ہیں۔ تو حق تعالیٰ ان کی صفت فرمارہے ہیں۔

عظیم شہادت

اگر کسی بڑے آدمی کی بڑائی کوئی چھوٹا آدمی بیان کرنے لگے تو وہ بڑائی نہیں سمجھی جاتی۔ یوں کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی تعریف کرنا چاہتا ہے۔ ع

مادح خورشید مداح خوداست

اگرسورج کی کوئی تعریف کرنے لگے تو یہ کہا جائے گا کہ اسے اپنی تعریف منظور ہے،سورج محتاجِ تعارف نہیں ہے۔تو کسی بڑے آدمی کا تعارف اگر چھوٹا کرائے، وہ درحقیقت اپنا تعارف کرا رہا ہے۔ بڑا تو خود ہی متعارف ہے۔لیکن اگر بڑا تعارف کرائے یہ فی الحقیقت ایک عظیم شہادت ہے۔تو جبریل علیہ السلام کا مثلاً میں تعارف کرانے لگوں۔تو یہ کہا جائے گا کہ میں اپنے تعارف اور اپنی عزت کا خواہاں ہوں کہ ایک بڑے آدمی کا نام لے رہا ہوں۔ایک بڑی شخصیت کا نام لے رہا ہوں۔جبریل علیہ السلام کا تعارف وہ کرائے جوخود جبریل کا خالق ہے جو جبریل کا معبود ہے، وہ فرماتے ہیں کہ جبریل رسول بھی ہیں، کریم بھی ہیں۔ذی قوت بھی ہیں، امانت دار بھی ہیں، مقرب بارگاہ بھی ہیں، عہدے دار بھی ہیں یعنی سید الملائکہ بھی ہیں۔ان کو ہم نے قاصد اور پیغمبر بنا کر بھیجا۔تو بھیجنے والے حق تعالیٰ جن کا علم لامحدود ہے۔ان کے علم کی کوئی حدونہایت نہیں۔جن کو بھیجا گیا وہ صاحب امانت ہیں اور جن کے پاس بھیجا گیا وہ نبی کریم ﷺ جن کو نبوت کا عہدہ دیا گیا کہ عالمِ بشریت میں اس سے بڑا کوئی کمال نہیں۔

عظمتِ سند

اور نبی کریم ﷺ فقط نبی ہی نہیں بلکہ خاتم النبیین ہیں۔خاتم کے معنی یہ ہیں کہ جو نبوت کے درجات کا منتہی ہو۔یعنی نبوت کے سارے مراتب ان کے اوپر آ کر ختم ہو جائیں۔کوئی ایسا درجہ باقی نہ رہے کہ کسی اور شخصیت کی ضرورت پڑے کہ وہ اس درجے کو لے کر سامنے آئے۔تو خاتم النبیین کا یہ مطلب ہے کہ نبوت کے کمالات کے جتنے درجات اور جتنے مراتب ہیں وہ اس ذات میں ہیں وہ اس ذات اقدس پر ختم ہو گئے۔

نبوت کی بنیاد دو ہی چیزوں کے اوپر ہے۔ایک کمالاتِ علمی اور ایک کمالاتِ اخلاق، جن

سے عمل کا سلسلہ چلتا ہے۔تو علم کے بارے میں تو فرمایا گیا **اوتیت علم الاولین والآخرین۔**

اگلوں اور پچھلوں کے تمام علوم آپ کو عطا کئے گئے اور اخلاق کے بارے میں فرمایا گیا

وانک لعلیٰ خلق عظیم

تو اخلاق بھی خلق عظیم، اور آپ کا علم اتنا جامع کہ اولین وآخرین کا تمام علم آپ کو دے دیا گیا۔

ظاہر بات ہے کہ جو ذات بابرکات علم میں بھی ساری مخلوق سے اکمل ہو، اخلاق میں بھی سارے مخلوق سے اکمل ہو۔تو اس کی نبوت بھی انبیاء علیہم السلام میں سے سب سے زیادہ مکمل ہوگی۔اس لیے آپ فقط نبی ہی نہیں بلکہ خاتم النبیین ہیں۔یعنی آپ کی ذات بابرکات پر نبوت کے مراتب ختم کردیئے گئے۔

تو ایسی ذات کے اوپر قرآن نازل ہو جو کمالات بشریہ میں سب سے زیادہ اکمل ہو۔اور ایسی ذات قرآن کو لے کر آئے جس کی حق تعالیٰ تعریف فرمائیں کہ ایک راوی میں جتنے اوصاف ہوسکتے ہیں وہ سب ان میں موجود ہوں۔اور قرآن کریم کو بھیجنے والی ذات حق تعالیٰ کی ہو جو سارے کمالات کا مصدر اور سرچشمہ ہے۔تو اوپر سے لے کر حضور ﷺ تک قرآن کریم کی سند اتنی مکمل ہے کہ اس میں کسی نقد وتبصرہ کی گنجائش نہیں۔

تواتر طبقہ

اس کے بعد جناب رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہؓ کو قرآن پڑھایا تو صحابہ نے طبقے کے طور پر اس کو لیا۔یعنی اِکّے دُکّے نے حفظ نہیں کیا۔ بلکہ جماعتوں کی جماعتیں اور طبقات کے طبقات حافظِ قرآن ہوئے۔انہوں نے پھر بعد والے طبقات کو حافظ بنایا۔اور طبقہ در طبقہ حافظ بنتے

چلے گئے۔اسی طرح آج تک تواترِ طبقہ کے ساتھ یہ قرآن کریم چلا آرہا ہے کہ ایک ایک اور دو دو یا بیس بیس اور چالیس چالیس نہیں سوسو اور پچاس پچاس نہیں بلکہ ہزاراں ہزار حفاظ ہر قرن میں موجود رہے۔اوپر کے قرن سے لیتے رہے اور نیچے کے قرن کو دیتے رہے تو جو کلامِ خداوندی اس حفاظت کے ساتھ آئے اور قیامت تک چلتا رہے۔اس میں کسی دغل وفصل یا تحریف کی گنجائش نہیں۔اگر کوئی تحریف کرنے والا تحریف کرے گا۔چوں کہ حفاظت کے سامان کافی ہیں اس لیے اس کی تحریف کھل جائے گی۔چناں چہ بہت سے محرفین پیدا ہوئے۔جنہوں نے معنیٰ کے لحاظ سے بھی تحریف کرنا چاہی لیکن دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر دیا گیا۔

ہمہ گیر ابدی حفاظت

حدیث میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

ہر صدی پر مجدد کا وعدہ کیا گیا ہے۔

ان الله يبعث لهذه الامة على رأس كل مأة سنة من يجدد لها دينها

ہر صدی کے اوپر اللہ مجدد بھیجے گا۔مجدد کے لیے کوئی شخص واحد ہونا ضروری نہیں۔جماعتیں بھی مجدد بن کر آئی ہیں۔افراد بھی مجدد بن کر آئے ہیں۔دین کے جس گوشے میں لوگوں نے خلط واقع کیا اور تنقیص واقع کی۔انہوں نے آ کر اسی کو کھول دیا۔تو ہر صدی پر مجددوں کا وعدہ دیا ہے۔

خود حضور ﷺ فرماتے ہیں

كيف تهلك امة انا اولها، والمسيح آخرها، والمهدى وسطها

وہ امت کیسے ہلاک ہو جائے گی جس کی ابتداء میں میں ہوں اور اخیر میں مسیح ہیں، اور بیچ میں مہدی ہیں۔

تو اول وآخر کی بھی حفاظت بتلائی گئی، ہر صدی کی حفاظت بتلائی گئی۔ پھر ہر صدی کے اندر اندر وعدہ دیا گیا۔

يحمل هذا العلم من كل خلف عدوله ينفون عنه تحريف الغالين و انتحال المبطلين وتاويل الجاهلين

ہر قرن اور زمانے کے اندر اس علم کو اٹھاتے رہیں گے۔ اسلاف میں سے اخلافِ رشید۔ نیک خلف، نیک سلف سے لیتے رہیں گے۔ اس علم کو امانت داری کے ساتھ سلف سے خلف قبول کرتے رہیں گے غلو کر نیوالے کے غلو کو توڑ دیں گے۔ غلو کرنے والے جو تحریفیں کریں گے اور معانی کے اندر جو تحریف واقع کر دیں گے اس کو مٹائیں گے، اور دروغ بافیوں اور جاہلانہ تاویلات کا پردہ چاک کرتے رہیں گے۔ بہر حال اس امت میں وعدہ دیا گیا کہ قیامت تک ایک طبقہ حقانی ضرور باقی رہے گا۔ جو بجنسہ قرآن کو مع اس کے لفظ و بیان اور مع اس کی شرح کے دیتا رہے گا تو سلف سے خلف تک پہنچتا رہے گا۔

جہاں یہ کہا گیا کہ امت میں فرقے ہوں گے اور اختلافات رونما ہوں گے وہاں یہ بھی وعدہ دے دیا گیا کہ قیامت تک ایک فرقہ ضرور حق کے او پر رہے گا۔ اور اپنے ذوق، وجدان اور دلائل سے لوگ سمجھتے رہیں گے کہ یہ فرقہ حقانی ہے۔ اس کے افعال و اعمال اور اس کی عادات بتلاتی رہیں گی کہ یہ حقانی ہے۔ اور لوگ اس کی طرف رجوع کرتے رہیں گے۔ غرض ایک طبقہ ہمیشہ باقی رہے گا جو صحیح مزاج کے ساتھ دین کو باقی رکھے گا۔ اور صحیح ذوق کے ساتھ اس کو قائم رکھے گا۔

لايضرهم من خذلهم و لامن خالفهم حتى ياتى امر الله.

نہ ان کو رسوا کرنے والا رسوا کر سکے گا۔ نہ ذلیل کرنے والا ذلیل کر سکے گا۔ وہ ایک ہی چیز کہتے رہیں گے کہ

ما انا عليه اليوم و اصحابى

جن کے اوپر آج کے دن میں (رسول اللہ ﷺ) اور میرے صحابہؓ ہیں۔ اسی کے مطابق لفظ اور معنیٰ اور حقائق و کیفیات دنیا کے سامنے پیش کرتے رہیں گے۔ بہر حال یہ وعدہ دیا گیا اور جہاں اختلافات کی خبر دی گئی وہیں ساتھ اس فرقۂ حقانی کی بھی خبر دی گئی۔ اس سے واضح ہوا کہ یہ دین خاتم النبیین کا دین ہے، قیامت تک باقی رہے گا کیوں کہ درجاتِ نبوت آپ ﷺ کی ذات بابرکات پہ ختم کردیئے گئے۔ اب کوئی درجہ باقی نہیں رہا کہ کسی شخصیت کو لاکر اسے پورا کیا جائے۔

بہر حال قرآن کریم کی حفاظتِ خداوندی کے سلسلہ میں مجددین کے وعدے الگ ہیں۔ ائمہ ہدایت کے وعدے الگ ہیں۔ خلفاء کے وعدے الگ ہیں۔ اور خلفِ عدول کے وعدے الگ ہیں۔ صلحاء کے وعدے الگ ہیں۔ یہ برابر بھیجے جاتے رہیں گے۔ اور دین کی حقانیت قائم رہے گی۔ تو یہ

انا نحن نزلنا الذکر و انا له لحافظون.

میں بتلایا گیا کہ جہاں قرآن کریم کے الفاظ محفوظ کئے گئے اور جہاں اس کا رسم الخط محفوظ کیا گیا، وہیں اس کے علوم اور معانی بھی محفوظ کئے گئے، وہیں اس کے احکام بھی محفوظ کئے گئے۔ تو اول سے لے کر اخیر تک اور ظاہر سے لے کر باطن تک قرآن کریم کا ایک ایک پہلو محفوظ ہے۔ اور محفوظ چلا جائے گا۔

بہر حال یہ بات میں نے اس پر عرض کی کہ یہ دارالقرآن قائم کیا گیا۔ بہر حال یہ بھی ایک خلافت خداوندی ہے۔ یہ الفاظ اور لب و لہجے کی خلافت ہے۔ جو نبی کریم ﷺ سے چلی ہے۔ قراء اور مجودین نے اسی لب و لہجے کی حفاظت کی کوشش کی ہے۔ نوعیت ایک رہتی ہے گو شخصی طور پر کچھ نہ کچھ فرق واقع ہوتا ہے۔

تغنی بالقرآن

اسی واسطے قرآن کریم کے بارے میں فرمایا گیا کہ

من لم یتغن بالقرآن فلیس منا

جو قرآن کریم کے ساتھ تغنّی نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

مگر تغنی کے معنی یہاں موسیقی کے نہیں ہیں۔گانے بجانے کے طرز پر پڑھنے کے متعلق دھمکی دی گئی ہے۔اگر کوئی قرآن کو مزامیر کی صورت سے پڑھے تو اسے عذاب کی دھمکی دی گئی ہے۔تو قرآن کا غنا الگ ہے گانے بجانے کا غنا الگ ہے۔قرآن کریم کی تغنی کی یہ تفسیر کی گئی ہے کہ اتنے درد آمیز لہجے کے ساتھ پڑھے کہ قرآن کی کیفیات ایک قلب سے دوسرے قلب میں پہنچنے لگیں۔تو وہ ایک خاص درد ایک خاص لب ولہجہ ہے قرّاء اور مجودین وہی اختیار کرتے ہیں۔

چناں چہ جب قرآن پڑھا جاتا ہے تو واقعہ یہ ہے کہ دنیا کی سینکڑوں قسم کی موسیقیاں ہیں۔ہر ملک کی موسیقی الگ ہے۔لیکن قرآن کا غنا وہ ہے کہ کسی موسیقی پہ منطبق نہیں۔اور کسی موسیقی میں وہ تاثیر نہیں جو اس میں تاثیر ہے اگر صحیح معنی میں کوئی پڑھنے والا موجود ہو اس سے دل کھنچتے ہیں۔تو فرمایا گیا:

من لم یتغن بالقرآن فلیس منا

کہیں فرمایا گیا

زینوا القرآن باصواتکم فان الصوت الحسن یزید القرآن حسنا

قرآن کریم کو خوش آوازی کے ساتھ پڑھو۔اس سے قرآن کا حُسن بڑھ جاتا ہے۔تو خوش آوازی میں اوپر والوں کی تقلید کرنی پڑے گی کہ جس انداز کی خوش آوازی صحابہؓ سے چلی آرہی ہے۔اور تابعین سے چلی آرہی ہے اور سلسلہ بسلسلہ پہنچی ہے۔اسی کے ساتھ تغنّی کرو۔اسی کے ساتھ حُسنِ صوت اختیار کرو۔تو قرآن کریم کی آواز اور لب ولہجہ اور طرزِ ادا تک محفوظ کیا گیا۔

تبریک

اور وہ قراء و مجودین مبارک باد کے مستحق ہیں۔جنہوں نے یہ خلافت خداوندی سنبھالی۔تو ایک خلافتِ علمی ہے۔ایک خلافت اخلاقی ہے۔ایک خلافت عملی ہے۔اور یہ خلافت صوتی ہے کہ آواز کے لحاظ سے بھی دنیا میں اللہ کے خلیفہ موجود ہیں۔کہ اس کے کلام کو اسی کے انداز سے پڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔اس واسطے مبارک باد کے مستحق ہیں۔اور دار القرآن بھی مبارک باد کا مستحق ہے۔جس نے قراء اور مجودین بنانے کا ایک راستہ پیدا کیا۔اس فنِ شریف کو پھیلانے کا ارادہ کیا۔بہر حال یہ اس کی برکات میں سے ایک برکت ہے کہ آپ حضرات یہاں جمع ہیں اور قرآن سننے کے لیے جمع ہوئے۔قراء اور مجودین کی محفل منعقد ہوئی۔کلامِ خداوندی پڑھا گیا۔تو حقیقت میں یہ کلام اللہ کا ہے۔

جیسے حضورﷺ نے غزوۂ بدر میں جب کفار کے اوپر کنکریاں پھینکی تھیں تو آپ کے بارے میں فرمایا گیا تھا۔

وما رميت اذ رميت ولكن الله رمىٰ

اے نبی! جب آپ کنکریاں پھینک رہے تھے وہ آپ نہیں پھینک رہے تھے۔وہ تو ہم پھینک رہے تھے۔یعنی اعضاء آپ کے تھے ہمارے کمالات کا ظہور ہو رہا تھا اور مظہر آپ بنے ہوئے تھے۔تو زبانیں ہماری ہیں، کلام خدا کا ہے۔اور انسان مظہر بنا ہوا ہے۔اس واسطے یہ ادارہ مستحقِ مبارک باد ہے جس نے قراء اور مجودین جمع بھی کئے ور آئندہ پیدا کرنے کا سلسلہ بھی ڈالا۔حق تعالیٰ شانہ کامیاب فرمائے۔اور اس ادارے سے بہت سے مجودین پیدا ہوں۔اور قرآن کریم کے پڑھنے کی اور اس فن تجوید کی اشاعت ہو۔اور لوگوں کے دلوں میں یہ گھر کرے اور پھر لوگ مائل ہوں اور اس کے علم و عمل کی طرف متوجہ ہوں۔آمین۔ ☆☆☆

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ ایک عارف باللہ اور محقق

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ

عموماً لوگ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کو ایک متکلم ومناظر ومحدث اور فقیہ (جدلی) کی حیثیت سے جانتے ہیں، ان کے علمی کمالات اور ان کی مناظرانہ تصنیفات کا مطالعہ کرنے والے، اپنے ذہن میں ان کا جو تصور قائم کرتے ہیں، وہ ایک نہایت ذہین وذکی، وسیع العلم، قوی الحجت اور ایک عالم ظاہر سے کچھ اور زیادہ نہیں ہوتا، ان کے شاگرد رشید حافظ ابن قیمؒ کو مستثنٰی کرکے (جنہوں نے شیخ الاسلام ہروی کی کتاب ''منازل السائرین'' کی شرح مدارج السالکین'' میں اپنی اور اپنے محبوب استاذ کی زندگی کا باطنی پہلو محفوظ کردیا ہے، اور یہ ثابت کردیا ہے کہ دونوں اعلا درجہ کے عارف باللہ اور صاحب ذوق ومعرفت بزرگ تھے، جن لوگوں نے عام سوانح نگاروں اور تذکرہ نویسوں کی مدد سے شیخ الاسلام کو سمجھنے کی کوشش کی ہے، یا ان کے متاخر متبعین ومنتسبین کو دیکھ کر ان کے متعلق قیاس کیا ہے، وہ ان کو ایک محدث خشک اور ایک عالم ظاہر بیں سے زیادہ مقام نہیں دے سکے، لیکن ''مدارج السالکین'' میں ابن قیم نے جستہ جستہ شیخ الاسلام کے جو اقوال واحوال پیش کئے ہیں، اور علامہ ذہبی وغیرہ نے ان کے تذکرہ میں برسبیل تذکرہ ان کے اخلاق واذاواق، عادات وشمائل اور اشغال واعمال کا تذکرہ کیا ہے، اس کو سامنے رکھنے سے ایک منصف شخص اس نتیجہ پر پہونچتا ہے کہ شیخ الاسلام کا شمار اس امت کے عارفین اور اہل اللہ میں کیا جانا چاہئے، اور اس کو اس بات کا وجدان حاصل ہوجاتا ہے کہ وہ ان منازل پر فائز اور ان مقاصد سے بہرہ مند تھے، جن کے حصول کے لیے سالہا سال ریاضت، مجاہدہ، ائمہ فن سلوک کی صحبت اور دوام ذکر ومراقبہ کا راستہ بالعموم اختیار کیا جاتا ہے، اور جس کو متاخرین صوفیا ''نسبت مع اللہ'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ وذلک فضل الله يوتيه من يشاء.)

اہل نظر اس حقیقت سے واقف ہیں کہ ذوق ومعرفت، ایمان حقیقی اور یقین، اخلاص واستقامت، تزکیۂ باطن اور تہذیب اخلاق، کامل اتباع سنت، اور فنافی الشریعت وہ حقیقی مقاصد ہیں جن کے لیے مختلف وسائل اختیار کئے جاتے ہیں، محققین ان مقاصد کے حصول کو کسی ایک وسیلہ میں منحصر نہیں مانتے، بلکہ کہنے والوں نے یہاں تک کہہ دیا ہے، (اور کچھ غلط نہیں کہا) کہ ''**طرق الوصول الی اللہ بعدد انفاس الخلائق** ''ابتدا میں ان مقاصد کے حصول کے لیے سب سے موثر اور طاقت ور ذریعہ صحبت نبوی تھی، جس کی کیمیا اثری عالم آشکارا ہے، اس نعمت سے محرومی کے بعد اطبائے امت اور خلفائے نبوت نے اپنے اپنے زمانے میں مختلف بدل تجویز کئے، آخر میں مختلف اسباب کی بنا پر صحبت اور کثرت ذکر پر زور دیا گیا، جس کا منقح اور مدون طریقہ وہ نظام ہے، جو تصوف وسلوک کے نام سے مشہور ہو گیا ہے، لیکن اس سے کسی کو انکار نہیں کہ ان مقاصد کا حصول ان وسائل پر منحصر نہیں، اجتباء وموہبت کے علاوہ ایمان واحتساب، محاسبۂ نفس، سنتوں کا تتبع، کتب حدیث وشمائل سے محبت وعظمت کے ساتھ اشتغال، کثرت نوافل ودعا، کثرت درود، نیت واحتساب کے ساتھ خدمت خلق، جہاد، امر بالمعروف ونہی عن المنکر، دعوت وتبلیغ ان میں سے کوئی ایک چیز بھی استحضار واہتمام کے ساتھ تقرب کا ذریعہ اور حصول نسبت کا سبب بن سکتی ہے، وسائل مختلف ہو سکتے ہیں، لیکن مقصود ایک ہے، شیخ الاسلام کے حالات کے مجموعہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کو یہ مقصود حاصل تھا، اور اسی کا اظہار یہاں مقصود ہے۔

کسی شخص کے متعلق اس کے بے تکلف حالات واذواق، اخلاق وعادات وکیفیات دیکھ کر اس بات کی شہادت دی جاسکتی ہے کہ وہ عارفین ومحققین اور مقبولین وکاملین میں سے تھا، اس کا کوئی ظاہری مقیاس اور پیمانہ اور کوئی منطقی دلیل نہیں ہوتی، اہل اللہ اور عارفین کے حالات بکثرت پڑھنے اور ان کی صحبت میں رہنے سے ایک سلیم الفطرت اور صحیح الذوق انسان کو ایک

ملکہ اور وجدان حاصل ہوجاتا ہے، جس سے وہ اس بات کا فیصلہ کرسکتا ہے، لیکن پھر بھی کچھ حالات اور علامات ایسی ہیں، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ شخص اپنی دینی سطح میں عوام سے بلند اور دین کی صحیح کفیات واذواق اور اہل اللہ کے اخلاق سے بہرہ مندہ ہے، مثلاً ذوق عبودیت وانابت (توجہ الی اللہ) کی ایک خاص کیفیت، عبادت کا ذوق وانہماک، ذوقِ دعاوابتہال، زہد، تجرید وتحقیر دنیا سخاوت وایثار، فروتنی اور بے نفسی، سکینت وسرور، کمال اتباع سنت، صالحین میں مقبولیت، اور علماء وقت کی شہادت متبعین ومحبین کی دین داری اور حسن سیرت، وغیرہ وغیرہ ہم اس موقع پر انہی عنوانات کے ذیل میں شیخ الاسلام کے معاصرین اور مورخین کی شہادت اور ان کے تاثرات نقل کرتے ہیں۔

ذوق عبودیت وانابت

ذوق عبودیت وانابت الی اللہ کی حقیقی کیفیت اس بات کی بین شہادت ہے کہ اس شخص کا باطن یقین سے معمور اللہ تعالی کی عظمت وکبریائی سے بھرپور، اپنی بے بسی، بے چارگی اور مالک الملک کے قدرت وجلال کے مشاہدے سے پرنور ہے، یہ یقین ومشاہدہ جب باطن میں پیدا ہوجاتا ہے، تب الفاظ واعمال سے ظاہر ہوتا ہے، اس سلسلہ میں حقیقت وتکلف میں زمین وآسمان کا فرق ہے، یہ فرق صاحبِ نظر اور صاحبِ وجدان سے چھپ نہیں سکتا۔

لیس التکحل فی العینین کالکحل

امام ابن تیمیہؒ کے واقعات بتلاتے ہیں کہ ان کو یقین ومشاہدہ حاصل تھا، اور اس نے ان کے اندر ایک افتقار واضطرار اور ایک انابت وعبودیت کی کیفیت پیدا کردی تھی، گذشتہ صفحات میں گذر چکا ہے کہ جب ان کو کسی مسئلہ میں اشکال یا کسی آیت کے سمجھنے میں دقت ہوتی تھی تو وہ کسی سنسان مسجد میں چلے جاتے تھے، اور پیشانی خاک پر رکھ کر دیر تک یہ کہتے رہتے تھے۔

”**یا معلم ابراهیم فهمنی**“ (اے ابراہیم کو علم عطا کرنے والے مجھے اس کی سمجھ عطا فرما) ذہبی کہتے ہیں:

لم ار مثله فی ابتهاله واستغاثته ۔ وکثرۃ توجہہ۔ میں نے گریہ وزاری اور اللہ سے استمداد اور فریاد اور توجہ الی اللہ میں ان کی نظیر نہیں دیکھی۔

وہ فرماتے ہیں:

انه لیقف خاطری فی المسئلة او الشئ او الحالة التی تشکل علی فاستغفر الله الف مرة او اکثر او اقل حتی ینشرح الصدر وینجلی الاشکال ما اشکل ۔ کسی وقت کسی مسئلہ میں میری طبیعت بند ہو جاتی ہے، یا کسی معاملے میں مجھے اشکال پیش آ تا ہے تو میں ایک ہزار بار استغفار کرتا ہوں، یا اس سے کم یا زیادہ یہاں تک کہ طبیعت کھل جاتی ہے، اور بدلی چھٹ جاتی ہے، اور اشکال رفع ہو جاتا ہے۔

اس کیفیت میں جلوت، مجمع، بازار، شور وشغب کوئی چیز مانع نہ ہوتی، فرماتے ہیں۔

واکون اذ ذاک فی السوق او المسجد او الدرب او المدرسة لایمنعنی ذلک من الذکر والاستغفار الا ان انال مطلوبی ۔ ایسی حالت میں کبھی بازار میں، کبھی مسجد میں یا گلی یا مدرسہ میں ہوتا ہوں، لیکن ذکر واستغفار میں کوئی رکاوٹ پیش نہیں اتی، اور برابر مشغول رہتا ہوں یہاں تک کہ مطلوب حاصل ہو جاتا ہے۔

یہ یقین اور ذوق عبودیت جب پیدا ہو جاتا ہے، اور باطن میں سرایت کر جاتا ہے، تو انسان میں اپنی بے بسی اور بے چارگی، اپنی تہی دستی وبے بضاعتی کا ایسا احساس پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ آستانۂ شاہی پر کشکول گدائی لے کر کھڑا ہو جاتا ہے، اور خدائی کا صدقہ اور رحمت کی بھیک مانگتا ہے، اس وقت اس کے روئیں روئیں سے یہ صدا آتی ہے کہ:

مفلسانیم آمدہ در کوئے تو — شیئاً للہ از جمال روئے تو

دست بکشا جانب زنبیل ما　　　آفرین بردست وبر بازوئے تو

ابن تیمیہؒ کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو یہ دولت فقر اور یہ عزت تذلل حاصل تھی، ابن قیمؒ بیان کرتے ہیں کہ میں نے شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کا اس بارہ میں ایسا حال دیکھا ہے، جو کسی کے یہاں نظر نہیں آیا، وہ فرماتے تھے کہ نہ میرے پاس کچھ ہے، نہ میرے اندر کچھ ہے، وہ اکثر یہ شعر پڑھتے۔

انا المکدی انا المکدی　　　وھکذا کان ابی وجدی

ترجمہ: ہاں میں تیرے در کا بھکاری ہوں! ہاں میں تیرے در کا بھکاری ہو! اور کوئی نیا بھکاری نہیں، خاندانی بھکاری ہوں، اور پشتینی سائل، میرا باپ بھی تیرے در کا بھکاری تھا اور میرا دادا بھی۔

ذوق عبادت وانہماک

عبادت کا ذوق اور اس میں انہماک اس وقت تک نہیں ہوسکتا، جب تک کہ انسان کو اس کی لذت اور اس کا حقیقی ذائقہ نہ نصیب ہو، اور وہ اس کے درد کی دوا، قلب کی غذا، اور روح کی قوت نہ بن جائے، اور اس کو مقام "**جعلت قرۃ عینی فی الصلاۃ**" اور "**ارحنا یا بلال**" سے مناسبت نہ بخشی جائے، ابن تیمیہؒ کے معاصرین اور واقفین حال اس کی شہادت دیتے ہیں کہ ان کو اس دولت بیدار سے حصہ ملا تھا، اور ان کو خلوت ومناجات اور نوافل وعبادات کا خاص ذوق تھا، اور ان کا انہماک اس سلسلہ میں بہت بڑھا ہوا تھا، "الکواکب الدریہ" میں ہے۔

وکان فی لیلہ منفردا عن الناس کلھم، خالیا بربہ عز وجل ضارعا الیہ مواظبا علی تلاوۃ القرآن العظیم مکررا لانواع التعبدات اللیلیۃ والنھاریۃ، وکان اذا دخل فی الصلاۃ ترتعد فرائصہ واعضاؤہ حتی یمیل یمنۃ ویسرۃ.

رات کو وہ تمام لوگوں سے علیحدہ رہتے تھے، اس وقت خدا کے سوا کوئی نہیں ہوتا تھا، وہ تھے، اور گریہ وزاری، برابر قرآن مجید پڑھتے رہتے، رات، اور دن مختلف قسم کے نوافل وعبادات میں مشغول رہتے، جب نماز شروع کرتے تو ان کے شانے اور اعضاء کانپنے لگتے یہاں تک کہ ان کو دائیں بائیں لرزش ہوتی۔

ایسے اہل قلوب اور اہل ذوق کی طاقت، اور نشاط، ذکر وعبادات سے قائم ہوتا ہے، اگر اس میں فرق واقع ہو تو ان کی قوت جواب دے جاتی ہے، اور ان کو محسوس ہوتا ہے کہ فاقہ ہوا، ابن قیم لکھتے ہیں:

وکان اذا صلی الفجر فی مکانه حتی یتعالی جدا یقول هذه غدوتی لو لم اتغد هذه الغدوة سقطت قوای.

نماز فجر کے بعد اپنی جگہ بیٹھے رہتے، یہاں تک کہ دن اچھی طرح چڑھ آتا، کوئی پوچھتا تو فرماتے یہ میرا ناشتہ ہے، اگر میں یہ ناشتہ نہ کروں تو میری قوت میں سقوط ہو جائے۔ اور میرے قوی کام نہ کریں۔

اس ذوقِ اہتمام کے بعد اللہ تعالیٰ استقامت عطا فرما دیتا ہے، اور ذکر وعبادت ومعمولات طبیعت ثانیہ بن جاتے ہیں۔ ذہبی لکھتے ہیں کہ:

له اوراد واذکار یدمنها بکیفیة وجمعیة ۔ وہ اپنے اذکار واوراد کی پوری پابندی کرتے تھے، اور ہر حالت میں جمعیت خاطر کے ساتھ ادا کرتے تھے۔

زہد وتجرید وتحقیر دنیا

زہد اور دنیا کی تحقیر کی سچی کیفیت اس وقت تک پیدا نہیں ہوسکتی جب تک کہ دنیا کی حقیقت پوری طرح منکشف اور ''**ان الدار الآخرة لهی الحیوان**'' اور ''**ماعند الله خیر**

وابقی '' کا حال پوری طرح طاری نہ ہوجائے ،اور یقین ومعرفت صحیحہ اور تعلق باللہ کے بغیر ممکن نہیں، ان کے معاصرین نے ان کے زہد وتجرید اور فقر اختیاری کا جابجا تذکرہ کیا ہے، ان کے رفیق درس اور ہم عصر شیخ علیم الدین البرزالی (م ۷۳۸ھ) فرماتے ہیں:

وجری علی طریقه واحدة من اختیار الفقر والتقلل من الدنیا ورد ما یفتح بــه علیـه ۔شروع سے آخر تک ان کی حالت یکساں رہی کہ انھوں نے ہمیشہ فقر کو ترجیح دی، دنیا سے بقدر ضرورت اور برائے نام تعلق رکھا اور جو ملا اس کو واپس کردیا۔

جب یہ کسی کا حال بن جاتا ہے، اور اللہ تعالی اس کو غنائے قلب کی دولت سرمدی سے نوازتا ہے، تو اس کو قیصر وکسریٰ کی سلطنت ہیچ معلوم ہونے لگتی ہے، اور وہ اس کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنا گناہ اور اللہ تعالی کی نعمت کی ناشکری سمجھتا ہے، اس وقت وہ بیخودری کے عالم میں کہتا ہے:

من دلق خود بافسر شاہاں نمی دہم　　من فقر خود بملک سلیمان نمی دہم
از رنج فقر در دلِ گنجے کہ یافتم　　ایں رنج را براحت شاہاں نمی دہم

اس کے مقام سے بےخبر کبھی اس کے بارے میں بدگمانی کرتے ہیں کہ وہ سلطنت پر طمع کی نگاہ ڈالتا ہے، اور وہ ان کی بےخبری اور بدذوقی پر ماتم کرتا ہے کہ اس دولت جاوید کے بعد بھی اس ملک فانی پر نگاہ کی جاسکتی ہے؟ ابن تیمیہؒ کا یہی حال تھا، الملک الناصر نے ایک مرتبہ ان سے کہا کہ میں نے سنا ہے کہ بہت سے لوگ آپ کے مطیع ہوگئے ہیں، اور آپ کے دل میں سلطنت پر قبضہ کرنے کا خیال ہے، شیخ نے بڑے اطمینان کے ساتھ بلند آواز سے جس کو تمام حاضرین نے سنا جواب دیا:

انـا افعل ذلک؟ والله ان ملکک وملک المغل لایساوی،عندی فلسا.
میں ایسا کروں گا؟ خدا کی قسم تمہاری اور تاتاریوں کی سلطنت مل کر بھی میری نگاہ میں ایک پیسے

کے برابر نہیں۔

سخاوت اور ایثار

اہل اللہ اور اخلاق نبوی کی میراث میں حصہ پانے والوں کی خاص صفت ایثار وسخاوت ہے، ابن قیمؒ نے ''زاد المعاد'' میں ''الم نشرح'' کی تفسیر میں لکھا ہے کہ شرح صدر کی دولت اور ایمان ویقین کا نتیجہ سخاوت اور ایثار ہے۔اس لیے جس کو اس دولت سے حصہ ملے گا،سخاوت اور ایثار اس کا شعار ہوگا، شیخ الاسلام کے معاصرین واحباب ان کی سخاوت کے لیے بے حد معترف اور ثناخواں ہیں، ''الکواکب الدریہ'' میں ہے کہ ''**وهو احد الاجواد الاسخياء الذين يضرب بهم المثل**۔وہ ان معدودے چند اہل سخاوت میں سے ہیں، جن کی سخاوت ضرب المثل ہے۔

الحافظ ابن فضل اللہ العمری جو ان کے معاصر ہیں، اس سخاوت کا حال اس طرح بیان کرتے ہیں:

كانت تاتيه القناطير المقنطرة من الذهب والفضة والخيل المسومة والانعام والحرث فيهب ذلك باجمعه ويضعه عند اهل الحاجة فی موضعه لاياخذ منه شيئا الا ليهبه ولا يحفظه الا ليذهبه.

ان کے پاس ڈھیروں سونا، چاندی، اعلیٰ اصیل گھوڑے، جانور املاک واموال آتے وہ سب کا سب اٹھا کر دوسروں کو دے دیتے یا اہل ضرورت کے پاس رکھوادیتے، اور صرف دوسروں کو دینے کے لیے لیتے اور صرف عطا کرنے کے لیے اٹھا رکھتے۔

ان کی سخاوت یہاں تک پہنچی ہوئی تھی کہ اگر دینے کے لیے کچھ نہ ہوتا تو کپڑا اتار کر دے دیتے۔

کان یتصدق حتی اذا لم یجد شیئا نزع بعضه ثیابه فیصل به الفقراء۔

وہ صدقہ کرتے تھے، جب کچھ پاس نہ ہوتا تو اپنا کوئی کپڑا ہی اٹھا کر دے دیتے اور اہل حاجت کی کاربرآری کرتے۔

ایک دوسرے صاحب فرماتے ہیں:

وکان یتفضل من قوته الرغیف والرغیفین فیوثر ذلک علی نفسه۔

کھانے سے ایک روٹی، دو روٹیاں بچالیتے اور اپنے اوپر ایثار کرکے دوسروں کو دے دیتے۔

ایثار کا ایک نازک مقام یہ ہے کہ آدمی اپنے دشمنوں اور حریفوں کے ساتھ فراخ دلی بلکہ عفو واحسان بلکہ اس سے بڑھ کر دعاء اور خیر خواہی کے ساتھ پیش آئے، یہ مقام انہی لوگوں کو حاصل ہوتا ہے، جو انانیت اور حظوظ نفس سے بہت آگے بڑھ چکے ہوں، اور ان پر نعمائے الٰہی کی ایسی بارش ہو اور سکینت وسرور اس درجہ کا حاصل ہو کہ وہ ان سب مخالفتوں کو ان کے مقابلے میں ہیچ اور پرکاہ سمجھتے ہوں، اور جن کے اندر اپنے دشمنوں اور مخالفین کے لیے بھی، خیر طلبی ورحم کا جذبہ پیدا ہوتا ہو، اوپر گذر چکا ہے کہ ۷۰۹ھ میں جب وہ دوسری بار رہا ہوئے تو سلطان نے تنہائی میں ان سے ان قضاۃ کے قتل کے بارے میں فتویٰ لینا چاہا، جنہوں نے جاشنگیر کی حمایت کی تھی، اور سلطان کی معزولی کا فتویٰ دیا تھا، اور یہ بھی کہا کہ انہوں نے آپ کے خلاف شورش برپا کی، اور آپ کو تکلیف پہنچائی، اس کے جواب میں ابن تیمیہؒ نے ان کی بڑی مدح وتوصیف کی، اور پرزور الفاظ میں سلطان سے ان کی سفارش کی، اور اس کو ان کے قتل کے ارادہ سے باز رکھا، ان کے سب سے بڑے حریف ومدمقابل قاضی ابن مخلوف مالکی کا یہ مقولہ بھی گذر چکا ہے، ''ہم نے ابن تیمیہؒ جیسا عالی ظرف وفراخ حوصلہ نہیں دیکھا کہ ہم نے تو ان کے خلاف سلطنت کو آمادہ کیا، لیکن ان کو جب قدرت حاصل ہوئی تو ہم کو صاف معاف کردیا اور الٹے ہماری طرف سے

وکالت ومدافعت کی۔‘‘

ان کے تلمیذ رشید اور ہر وقت کے ساتھی، حافظ ابن قیمؒ کہتے ہیں کہ وہ اپنے دشمنوں کے لیے دعائے خیر کرتے تھے، میں نے نہیں دیکھا کہ وہ ان میں سے کسی کے لیے بد دعا کرتے ہیں، میں ایک روز ان کے سب سے بڑے حریف اور ایک ایسے صاحب کی خبر وفات لے کر آیا جو عداوت اور ان کو ایذاء پہونچانے میں سب سے آگے تھے، انہوں نے مجھے جھڑک دیا، اور منہ پھیر لیا،’’ **انا للہ وانا الیہ راجعون** ‘‘پڑھی، پھر فوراً ان کے مکان پر گئے، ان کی تعزیت کی، اور فرمایا کہ مجھے ان کی جگہ پر سمجھنا، جس چیز کی تم کو ضرورت پڑے گی میں تمہاری اس میں مدد کروں گا، اسی طرح ان سے ایسی ملاطفت اور دلجوئی کی باتیں کی، جن سے وہ نہایت مسرور ہوئے، اور ان کو بڑی دعائیں دیں، اور ان کو اس پر سخت استعجاب ہوا۔

عفو و احسان، اعداء و مخالفین کے ساتھ شفقت و مرحمت کا یہ مقام مالی ایثار سے بہت بلند اور آگے مقام ہے، یہ وہ مقام ہے، جو صدیقین اور خواص اولیاء کو ملتا ہے، ابن تیمیہؒ اس مقام پر فائز تھے، اور گویا زبان حال سے وہ کہتے تھے، جو اسی مقام کے کسی صاحب حال شاعر نے فارسی میں کہا ہے ۔

ہر کہ مارا یار نبود ایزد اورا یار بود ہر کہ مارا رنج دادہ، راحتش بسیار باد

ہر کہ اندر راہ ما خارے نہد از دشمنی ہر گلے کز باغ عمرش بشگفد بے خار باد

فروتنی و بےنفسی

فروتنی اور بےنفسی اہل اللہ کی خاص صفت اور وہ مرتبۂ کمال ہے، جو ہزار کرامتوں سے بلند اور ہزار فضیلتوں سے بالاتر ہے، یہ مقام اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب خودی مٹ جاتی ہے، اور نفس کا کامل تزکیہ ہو جاتا ہے، شیخ الاسلام کو اپنے کمالات علمی اور عروج دینی و دنیوی کے ساتھ یہ

کمال بھی حاصل تھا، ان کے اقوال پتہ دیتے ہیں کہ وہ بے نفسی وللّٰہیت اور ہضم نفس اور انکار ذات کے درجۂ علیا پر پہونچے ہوئے تھے، ابن قیمؒ فرماتے ہیں کہ وہ اکثر کہتے تھے ''مالی شئ ولا منی شئ''، اگر کوئی ان کے منہ پر ان کی تعریف کرتا تو فرماتے:

والله انی الی الآن اجدد اسلامی کل وقت وما اسلمت بعد اسلاما جیدا ۔خدا کی قسم میں ابھی تک اپنے اسلام کی تجدید کرتا رہتا ہوں، اور ابھی تک نہیں کہہ سکتا کہ کامل طور پر مسلمان ہوں۔

کبھی کوئی تعریف کرتا تو یوں بھی فرماتے ''**انا رجل ملة لا رجل دولة**''۔ میں امت کا ایک عام آدمی ہوں، سلطنت وحکومت کا آدمی نہیں۔

بے نفسی وعبودیت کے اس درجہ پر پہونچ کر آدمی کی یہ حالت ہوجاتی ہے کہ وہ اپنا نہ کسی پر کوئی نہ حق سمجھتا ہے، نہ اس کا کوئی مطالبہ کرتا ہے، نہ اس کو کسی سے شکایت ہوتی ہے، نہ اپنے نفس کا انتقام لیتا ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کو اس مقام پر پہونچادیا تھا، ابن قیم فرماتے ہیں:

سمعت شیخ الاسلام ابن تیمیة قدس الله روحه یقول العارف لایری له علی احد حقا ولایشهد له علی غیره فضلا ولذلک لایعاتب ولایطالب ولایضارب.

میں نے شیخ الاسلام ابن تیمیہ قدس اللہ سرہ سے سنا ہے، وہ فرماتے تھے کہ عارف اپنا کسی پر کوئی حق نہیں سمجھتا اور نہ یہ جانتا ہے کہ اس کو کسی پر کوئی فضیلت حاصل ہے اسی لیے نہ وہ کسی سے شکایت کرتا ہے۔ نہ مطالبہ کرتا ہے، نہ مار پیٹ کرتا ہے۔

ان کے حالات سے واقفیت رکھنے والے جانتے ہیں کہ وہ ''حدیث دیگراں'' میں اپنا ہی حال بیان کررہے ہیں۔

سکینت وسرور

اس ایمان ویقین اور اللہ تعالی کے ساتھ اس صحیح تعلق، اور مخلوق سے آزادی، اور قلب کی وارستگی اور بے تعلقی کے بعد انسان کو وہ سکینت وسرور حاصل ہوتا ہے کہ اس زندگی ہی میں اس کو جنت کا مزہ آنے لگتا ہے، شیخ الاسلام نے (جیسا کہ ابن قیم نے نقل کیا ہے) خود ایک بار فرمایا:

ان فی الدنیا جنة من لم یدخلها لم یدخل جنة الآخرة ۔دنیا میں مومن کے لیے ایک ایسی جنت ہے کہ جو اس میں یہاں داخل نہیں ہوا آخرت کی جنت سے محروم رہے گا۔

اہل نظر جانتے ہیں کہ اللہ تعالی کبھی اپنے مخلص بندوں کو اس زندگی میں بھی ''لاخوف علیہم ولاہم یحزنون'' کی دولت عطا فرماتا ہے، اور وہ اس کا نمونہ (بقدر وسعتِ دنیا) یہاں بھی دیکھ لیتے ہیں، شیخ الاسلام اور ان کے رفقاء کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو یہ دولت حاصل تھی، خود بھی ایک بار جوش میں آکر فرمایا:

ما یصنع اعدائی بی ان جنتی وبستانی فی صدری ان رحت فهی معی لاتفارقنی ۔میرے دشمن میرا کیا بگاڑ سکتے ہیں، میری جنت اور میرا باغ میرے سینے میں ہے جہاں جاؤں گا، وہ میرے ساتھ ہے۔

یہ نسبت سکینت ورضاء، زندگی میں اور بعد وفات ان کے ساتھ رہی، ابن قیم نے لکھا ہے کہ میں نے ایک مرتبہ ان کو خواب میں دیکھا، میں نے ان سے بعض اعمال قلبیہ کا ذکر کیا، اس پر شیخ نے فرمایا:

اما انا فطریقی الفرح والسرور به ۔بھائی میری نسبت تو فرحت وسرور کی ہے۔

ابن قیم لکھتے ہیں:

وهکذا کانت حاله فی الحیاة یبدو ذلک علی ظاهره وینادی به علیه

حاله ۔یہی حالت ان کی زندگی میں تھی کہ ان کے چہرے پر فرحت وسرور کے آ ثار نظر آ تے تھے اوران کی کیفیت اس کا اعلان کرتی تھی ۔

کمال اتباعِ سنت

اس مقام (قبولیت وصدیقیت) کی ابتدا اتباع سنت سے ہے،اوراس کی انتہاء بھی کمالِ اتباع سنت پر ہے، حدیث وسنت کے ساتھ ابن تیمیہ کا شغف وانہماک ان کے مخالفین کو بھی تسلیم ہے،لیکن یہ شغف وانہماک محض علمی ونظری نہ تھا،علمی اور ظاہری بھی تھا،ان کے معاصرین شہادت دیتے ہیں کہ مقام رسالت کا جیسا ادب واحترام اوراتباع سنت کا جیسا اہتمام ابن تیمیہ کے یہاں دیکھا،کسی اور کے یہاں نظر نہیں آیا،حافظ سراج الدین البزار قسم کھا کر کہتے ہیں:

لا واللہ مارأیت احدا اشد تعظیما لرسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم ولااحرص علی اتباعه ونصر ماجاء به منه.

خدا کی قسم میں نے رسول اللہ ﷺ کا اتنا ادب واحترام کرنے والا اورآپ کے اتباع اور آپ کے دین کی نصرت کی حرص رکھنے والا ابن تیمیہؒ سے بڑھ کر نہیں دیکھا۔

یہ چیز ان پر اتنی غالب اوران کی زندگی میں نمایاں تھی ، کہ دیکھنے والوں کا قلب شہادت دیتا تھا کہ اتباع کامل اورسنت کا عشق اسی کا نام ہے،علامہ عمادالدین الواسطی فرماتے ہیں:

ما رأینا فی عصرنا ھذا من تستجلی النبوة المحمدیة وسننها من اقواله وافعاله الا ھذا الرجل یشھد القلب الصحیح ان ھذا ھو الاتباع حقیقة ۔ہم نے اپنے زمانے میں ابن تیمیہ ہی کوایسا پایا کہ نبوت محمدی کا نوران کی زندگی میں اورسنتوں کا اتباع ان کے اقوال وافعال میں عیاں تھا۔قلب سلیم اس کی شہادت دیتا کہ حقیقی اتباع اور کامل پیروی اسی کا نام ہے۔

صالحین میں مقبولیت اور علماء وقت کی شہادت

کسی انبوہ اور عوام کی بھیڑ کا کسی شخص کی تعریف کرنا مقبولیت عند اللہ واستقامت اور علو مرتبت کی دلیل نہیں، دلیل اس زمانے اہل صلاح واستقامت اور اہل علم اور اہل بصیرت کی شہادت اور توصیف ہے، نیز یہ کہ اس کے پیرووں، اس سے محبت اور تعلق رکھنے والوں اور اس کے پاس بیٹھنے والوں میں صلاح وسداد، حسن اعتقاد، تقوی اور احتیاط اور آخرت کی فکر اور اہتمام پایا جائے، اور وہ اپنے ابنائے زنانہ سے اپنی دینداری اور سلامت روی میں ممتاز ہوں، ابن تیمیہؒ کا معاملہ یہی تھا کہ اس زمانے کے ممتاز ترین اہل صلاح ورشد اور اصحاب علم ونظر ان کی عظمت وفضیلت، صحت اعتقاد اور سلامت عقیدہ کے قائل ومعترف اور ان کے مداح تھے، اور ان کے مخالفین میں بڑی تعداد حکومت کے متوسلین اور ابنائے دنیا کی تھی، جو جاہ طلبی کے مریض اور دولت وعزت کے خواہاں تھے۔ صاحب ''کواکب'' لکھتے ہیں:

قالوا ومن امعن النظر ببصيرته لم ير عالما من اهل بلد شاء موافقا له الا ورآه من اتبع علماء بلده للكتاب والسنة واشغلهم بطلب الآخرة والرغبة فيها وابلغهم فى الاعراض عن الدنيا والاهمال لها ولايرى عالما مخالفا له منحرفا عنه الا وهو من اكبرهم فهمة فى جمع الدنيا واكثرهم رياء او سمعة. والله اعلم

لوگ بیان کرتے ہیں کہ جو ذرا غور سے کام لے گا، وہ دیکھے گا کہ ان کا جو موافق جس شہر میں بھی ہے، وہ اس شہر کے علماء میں سب سے زیادہ کتاب وسنت کا متبع اور طلب آخرت میں مشغول اور سب سے زیادہ اس کا حریص اور دنیا سے بے پروا اور اس کی طرف غیر متوجہ نظر آئے گا، اس کے برخلاف ان کا جو مخالف نظر آئے گا وہ دنیا کا حریص، بوالہوس ریا کار اور شہرت کا

طالب دکھائی دے گا۔ واللہ اعلم

علامہ ذہبی کے یہ الفاظ بھی فراموش کرنے کے قابل نہیں:

واخیف فی نصر السنة المحفوظة حتی اعلی الله تعالی مناره وجمع قلوب اهل التقوی علی محبته والدعاء له ۔سنت کی نصرت کے جرم میں ان کو بہت ڈرایا دھمکایا گیا یہاں تک کہ اللہ تعالی نے ان کو سرخرو اور معزز کیا، اور اہلِ تقویٰ کے قلوب کو ان کی محبت اور دعاء کے لیے مجتمع کر دیا۔

☆☆☆

اعلان

محترم قارئین اذانِ بلال!

یہ اطلاع افسوس کے ساتھ دی جاتی ہے کہ دار العلوم آگرہ کے بانی حضرت مولانا ابوالبرکات صاحب مظاہری رحمۃ اللہ علیہ ۲۸/رمضان المبارک ۱۴۴۶ھ کو وفات پا گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

آپ نے نامساعد حالات میں ادارہ قائم کر کے اسے عظیم دینی مرکز بنایا۔

ماہنامہ اذانِ بلال کے مدیر اعلیٰ کی حیثیت سے آپ کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ ادارہ آئندہ شمارہ آپ کی حیات وخدمات پر شائع کرنا چاہتا ہے۔

لہذا تمام حضرات سے گزارش ہے کہ حضرت سے متعلق معلومات وواقعات تحریر کر کے ارسال فرمائیں۔ تاکہ انہیں شمارہ میں شامل کیا جا سکے۔

رابطہ: 9557358285

9358759150

پاکی اور صفائی

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب

تقریباً دو سال پہلے میں برطانیہ کے ایک سفر کے دوران برمنگھم سے ٹرین کے ذریعے ایڈنبرا جارہا تھا، راستے میں مجھے غسل خانہ استعمال کرنے کی ضرورت پیش آئی، میں اپنی سیٹ سے اٹھ کر غسل خانے کی طرف چلا تو دیکھا کہ وہاں ایک انگریز خاتون پہلے سے انتظار میں کھڑی ہیں جس سے اندازہ ہوا کہ غسل خانہ خالی نہیں ہے، چناں چہ میں ایک قریبی سیٹ پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگا، جب کچھ دیر گذر گئی تو اچانک غسل خانے کے دروازے پر میری نگاہ پڑی، وہاں Vacant کی تختی صاف نظر آرہی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ غسل خانہ خالی ہے، اوراس میں کوئی نہیں ہے، اس کے باوجود وہ خاتون بدستور دروازے کے سامنے کھڑی ہوئی تھیں، اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ شاید ان کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے، میں نے قریب جا کر ان سے کہا کہ غسل خانہ تو خالی ہے، اگر آپ اندر جانا چاہیں تو چلی جائیں، انہوں نے جواب دیا کہ دراصل غسل خانے کے اندر میں ہی تھی، لیکن جب میں پیشاب سے فارغ ہوئی تو ریل پلیٹ فارم پر رک گئی، اور میں کموڈ کو فلش نہیں کرسکی (یعنی اس پر پانی نہیں بہاسکی) کیوں کہ جب گاڑی پلیٹ فارم پر کھڑی ہوتو فلش کرنا مناسب نہیں، اب میں باہر آ کر اس انتظار میں ہوں کہ گاڑی چلے تو میں اندر جا کر کموڈ کو فلش کروں، پھر اپنی سیٹ پر جا کر بیٹھوں گی۔

یہ بظاہر ایک چھوٹا سا معمولی واقعہ تھا، لیکن میرے ذہن پر ایک نقش چھوڑ گیا، یہ ایک انگریز خاتون تھیں، اور بظاہر غیر مسلم، لیکن انہوں نے جو طرزِ عمل اختیار کیا، وہ دراصل اسلام کی تعلیم

تھی، مجھے یاد ہے کہ میرے بچپن میں ایک صاحب سے ایک مرتبہ یہ غلطی سرزد ہوئی کہ وہ غسل خانہ استعمال کرنے کے بعد اسے فلش کئے بغیر باہر آگئے تو میرے والد ماجد (حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ) نے اس پر انہیں سخت تنبیہ کی، اور فرمایا کہ ایسا کرنا اسلامی تعلیمات کے مطابق سخت گناہ ہے، کیوں کہ اس طرح گندگی پھیلانے سے آنے والے شخص کو تکلیف ہوگی، اور کسی بھی شخص کو تکلیف پہنچانا گناہ ہے۔

دوسری طرف جب گاڑی پلیٹ فارم پر کھڑی ہو تو اس وقت غسل خانے کا استعمال یا اسے فلش کرنا ریلوے کے قواعد کے تحت اس لیے منع ہے کہ اس کے نتیجے میں ریلوے اسٹیشن کی فضا خراب ہوتی ہے، اور وہ گندگی بیماریاں پھیلنے کا ذریعہ بن سکتی ہے، اس خاتون نے بیک وقت دونوں باتوں کا خیال کیا، ٹرین کے کھڑے ہونے کی حالت میں پانی بہانا بھی گوارا نہ کیا، اور پانی بہائے بغیر سیٹ پر آکر بیٹھنا بھی پسند نہیں کیا، تاکہ کوئی شخص اس حالت میں جا کر تکلیف نہ اٹھائے۔

ہم مسلمان ہیں، اور ہماری ہر دینی تعلیم کا آغاز ہی طہارت سے ہوتا ہے، جسے آں حضرت ﷺ نے ''ایمان کا آدھا حصہ'' قرار دیا ہے، نیز آپ ﷺ نے انتہائی باریک بینی سے ہر اس کام سے منع فرمایا ہے جو ناحق کسی دوسرے کو تکلیف کا باعث ہو، لیکن یہ بات کہتے ہوئے بھی شرم آتی ہے کہ ہمارے مشترک غسل خانے، خواہ وہ ریل میں ہوں یا جہاز میں، بازار میں ہوں یا مسجدوں میں، تعلیم گاہوں میں ہوں یا شفاخانوں میں، ہر جگہ عموماً گندگی کے ایسے مراکز بنے ہوئے ہیں کہ ان کے قریب سے گذرنا مشکل ہوتا ہے، اور جب تک کوئی بپتا ہی نہ پڑ جائے، کسی سلیم الطبع شخص کے لیے ان کا استعمال ایک شدید آزمائش سے کم نہیں۔ اس صورتِ حال کی بڑی وجہ یہ

ہے کہ ان معاملات میں ہم نے دین کی تعلیمات کو بالکل نظر انداز کیا ہوا ہے، اور مشترک استعمال کے مقامات پر گندگی پھیلانے کے بعد ہمیں یہ خیال بھی نہیں آتا کہ ہم اذیت رسانی کے گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں، جس کا ہمیں جواب دینا پڑے گا۔

ہمارے ملک میں بھی ریلوں کے ہر غسل خانے میں یہ ہدایت درج ہے کہ جب تک گاڑی کسی اسٹیشن پر کھڑی ہو، بیت الخلا استعمال نہ کیا جائے، لیکن عملاً صورتِ حال یہ ہے کہ کوئی اسٹیشن مشکل ہی سے ایسا ہوگا جس کی ریلوے لائن پر اس ہدایت کی خلاف ورزی کے مکروہ مناظر نظر نہ آتے ہوں، اسی طرح ہوئی جہازوں کے ہر غسل خانے میں یہ ہدایت درج ہوتی ہے کہ بیت الخلا میں کوئی ٹھوس چیز نہ پھینکی جائے، نیز یہ کہ منہ ہاتھ دھونے کے لیے جو بیسن لگا ہوتا ہے اسے استعمال کرنے کے بعد آنے والے مسافر کی سہولت کے لیے اسے کاغذ کے تولیہ سے صاف کر دیا جائے، لیکن ان ہدایات پر بھی کما حقہ عمل نہیں کیا جاتا، چناں چہ ہمارے ہوائی جہازوں کے غسل خانے بھی اب ہمارے مجموعی قومی مزاج کی نہایت بھدی تصویر پیش کرتے ہیں، حالاں کہ اگر ان ہدایت پر عمل کر کے ہم دوسروں کے لیے راحت کا سامان مہیا کریں تو یہ محض ایک شائستگی کی بات ہی نہیں ہے بلکہ یقیناً اجر وثواب کا کام ہے۔

آں حضرت ﷺ کا ایک ارشاد اتنا مشہور ہے کہ بہت سے مسلمانوں کو معلوم ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''ایمان کے ستر سے بھی زیادہ شعبے ہیں، اوران میں سے ادنی ترین شعبہ یہ ہے کہ راستے سے گندگی یا تکلیف دہ چیز کو دور کر دیا جائے۔'' اس ارشاد نبوی ﷺ کی روشنی میں مؤمن کا کام تو یہ ہے کہ اگر کسی دوسرے شخص نے بھی کوئی گندگی پھیلا دی ہے اور اندیشہ ہے کہ لوگوں کو اس سے تکلیف پہنچے گی، تو وہ خود اسے دور کر دے، نہ یہ کہ خود گندگی پھیلاتا پھرے، اگر

گندگی دور کرنا ایمان کا شعبہ ہے تو گندگی پھیلانا کس چیز کا شعبہ ہوگا؟ ظاہر ہے کہ بے ایمانی کا، یا کفر وفسق کا؟ لیکن ہم نے اپنے عمل سے کچھ ایسا تاثر دے رکھا ہے کہ صفائی ستھرائی درحقیقت ہمارا نہیں، بلکہ غیر مسلم مغربی اقوام کا شیوہ ہے۔

یہاں مجھے پھر اپنے والدِ ماجد کا سنایا ہوا ایک لطیفہ یاد آ گیا، وہ فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ ہندوستان میں ایک انگریز مسلمان ہوگیا، اور اس نے پانچوں وقت نماز پڑھنے کے لیے مسجد میں آنا شروع کر دیا، جب کبھی اسے وضوخانے میں جانے کی ضرورت پیش آتی تو یہ دیکھ کر اس کا دل کڑھتا تھا کہ نالیوں میں گندگی پڑی رہتی ہے، کناروں پر کائی جمی رہتی ہے، نہ لوگ ان میں گندگی ڈالنے سے پرہیز کرتے ہیں نہ ان کی صفائی کا کوئی انتظام ہے، آخر ایک روز اس نے یہ طے کیا کہ اس مقدس عبادت گاہ کو صاف رکھنا چوں کہ بڑے ثواب کا کام ہے، اس لیے وہ خود ہی یہ خدمت انجام دے گا، چناں چہ وہ کہیں سے جھاڑو وغیرہ لا کر اپنے ہاتھ سے اسے صاف کرنے لگا، معقول مسلمانوں نے تو یقیناً اس کے اس عمل کی قدر کی ہوگی، لیکن محلے کے ایک صاحب نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ''یہ انگریز مسلمان تو ہوگیا، لیکن اس کے دماغ سے انگریزیت کی خو بو نہیں گئی۔''

جن صاحب نے یہ افسوس ناک تبصرہ کیا، انہوں نے تو کھل کر صریح لفظوں ہی میں یہ بات کہہ دی، لیکن اگر ہمارے مجموعی طرزِ عمل کا جائزہ لیا جائے تو محسوس یہ ہی ہوتا ہے کہ ہم نے صفائی ستھرائی کو ''انگریزیت کی خو بو'' قرار دے رکھا ہے۔ اور شاید گندگی کو اپنی خو بو، حالاں کہ اسلام نے، جس کے ہم نام لیوا ہیں، صفائی ستھرائی سے بھی بہت آگے بڑھ کر طہارت کا وہ تصور پیش کیا ہے جو ظاہری صفائی سے کہیں بلند وبرتر ہے، اور جسم کے ساتھ روح کی پاکیزگی کے وہ طریقے

سکھاتا ہے جن سے بیشتر غیر اسلامی اقوام محروم ہیں، اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ جن مغربی اقوام کی ظاہری صفائی پسندی کا ذکر پیچھے آیا ہے، ان کا یہ ذوق صرف اس صفائی کی حد تک محدود ہے جو دوسرے کو نظر آئے، لیکن جہاں تک ذاتی اور اندرونی (Intrinsic) صفائی کا تعلق ہے، اس سے ان اقوام کی محرومی کا تھوڑا سا اندازہ ان طریقوں کو دیکھ کر لگایا جاسکتا ہے جو وہ بیت الخلا استعمال کرنے کے بعد اپنے جسم کی صفائی کے لیے اختیار کرتے ہیں، جب تک اس عمل کے بعد نہانا نہ ہو، جسم سے گندگی دور کرنے کے لیے پانی کے استعمال کا ان کے یہاں کوئی تصور نہیں، اس بات کا تو ان کے یہاں بڑا اہتمام ہے کہ غسل خانے کے فرش پر پاک پانی کی بھی کوئی چھینٹ پڑی نظر نہ آئے، لیکن جسم سے نجاست اور گندگی کو دور کرنے کے لیے صرف ٹوائلیٹ پیپر کو کافی سمجھا جاتا ہے، حالاں کہ پانی کے استعمال کے بغیر گندگی کا کلی ازالہ مشکل ہے، چناں چہ اگر گندگی کے کچھ چھوٹے اجزاء جسم یا کپڑے پر اس طرح باقی رہ جائیں کہ وہ نظر نہ آئیں تو ان کے ازالے کی اتنی فکر نہیں ہے۔ پھر اگر اس عمل کے بعد غسل بھی کرنا ہو تو عموماً اس کا طریقہ یہ ہے کہ ٹپ میں پانی جمع کر کے اسی حالت میں پانی کے اندر اس طرح داخل ہو جاتے ہیں کہ پانی کے اخراج کا کوئی راستہ نہیں ہوتا، اور نجاست کے باقی ماندہ چھوٹے اجزاء بعض اوقات پورے پانی کو ناپاک کر سکتے ہیں۔

یہ تمام طریقے اس لیے اختیار کئے گئے ہیں کہ سارا زور صرف اس ظاہری صفائی پر ہے جو دوسرے کو نظر آئے، ذاتی اور اندرونی صفائی جس کا نام ''طہارت'' ہے اس کوئی تصور نہیں، اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اسلام نے ہمیں ظاہری صفائی ستھرائی (نظافت) کے ساتھ ساتھ ''طہارت'' (پاکی) کے بھی مفصل احکام دیئے ہیں، اس لیے اسلام میں صفائی کا تصور کہیں

زیادہ جامع، ہمہ گیر اور بلند و برتر ہے، اسلام کو ''طہارت'' بھی مطلوب ہے اور نظافت بھی، طہارت کا مقصد یہ ہے کہ انسان بذاتِ خود واقعی پاک صاف رہے، اور نظافت کا مقصد یہ ہے کہ وہ اپنی گندگی سے دوسروں کے لیے تکلیف کا باعث نہ بنے۔

آں حضرت ﷺ کے عہد مبارک میں مسجد نبوی اتنی زیادہ کشادہ نہیں تھی، عام طور سے صحابہ کرامؓ محنت پیشہ تھے، اور موٹے کپڑے پہنتے تھے، گرمی کے موسم میں جب پسینہ آتا تو کپڑے پسینہ سے تر ہوجاتے، اور جمعہ کے اجتماع میں اس پسینے کی وجہ سے بو پیدا ہوجانے کا اندیشہ تھا، اس لیے آن حضرت ﷺ نے صحابۂ کرامؓ کو تاکید فرمائی کہ جمعہ کے روز سب حضرات غسل کرکے، حتی الامکان صاف کپڑے پہن کر اور خوشبو لگا کر مسجد میں آیا کریں۔ اب ظاہر ہے کہ طہارت کا کم سے کم تقاضا تو اس طرح بھی پورا ہوسکتا تھا کہ لوگ وضو کرکے آجایا کریں، اور ان کے کپڑے ظاہری نجاست سے پاک ہوں، لیکن آں حضرت ﷺ نے اس پر اکتفا کرنے کے بجائے مذکورہ لا احکام نظاقت کی اہمیت کی وجہ سے عطا فرمائے۔ تاکہ کوئی شخص کسی دوسرے کے لیے تکلیف کا باعث نہ بنے، اس چھوٹی سی مثال ہی سے یہ بات واضح ہے کہ طہارت کے ساتھ ساتھ نظافت بھی اسلام میں مطلوب ہے، اور کوئی بھی ایسا اقدام جائز نہیں ہے جس کی وجہ سے ماحول میں گندگی پھیلتی ہو، یہ ہر شخص کی ایسی دینی ذمہ داری ہے جس کی ادائیگی کے لیے بنیادی ضرورت توجہ کی ہے، یہ توجہ پیدا ہوجائے تو دیکھتے ہی دیکھتے ماحول سدھر جاتا ہے۔

۳/ اکتوبر ۱۹۹۴ء

☆☆☆

اجتماعی زندگی کی وحدتیں اور خاندان

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ

موجودہ سماج کا تنوع اور قسمیں

انسانی سماج آج جس قدر پیچیدہ اور وسیع ہے اتنا پہلے زمانہ میں نہ تھا۔ آج اس کے اندر تنوع بھی ہے اور اس کی چھوٹی وحدتوں میں کثرت بھی ہے۔ یہ وحدتیں نسل کی بنیاد پر، ذہن کی بنیاد پر، مذہب کی بنیاد پر، کام اور مشغولیت کی بنیاد پر، تعلیم وصنعت کی بنیاد پر، اور بھی دیگر بنیادوں پر قائم ہیں، لیکن یہ سب وحدتیں ایک بہت بڑی وحدت کے اندر داخل اور ضم ہیں جو تقریباً پوری دنیا پر محیط ہے، اور اگر احتیاط کے ساتھ کہا جائے تو اس بڑی وحدت سے دنیا کے بڑے بڑے خطوں کو وحدتوں میں تقسیم کیا جا چکا ہے۔

متمدن سماجی ادارے

متمدن انسانی سماج کو تین اداروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ یہ تین ادارے (۱) خاندان (۲) مدرسہ (۳) عام معاشرہ ہیں۔ موجودہ معاشرہ انسانی آسانی کے ساتھ ان تین اداروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے اور اس تقسیم کی بنیاد پر ان کے حالات اور تقاضوں اور دشواریوں پر نظر ڈالی جا سکتی ہے اور پھر ان کی تعلیم وتربیت کی صورتِ حال کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔

سماج کا خاندانی اصول

لیکن قدیم زمانوں میں معاشرہ انسانی میں خاندانی اصول بہت غالب تھا، اس کے علاوہ دیگر وحدتی بنیادیں قابل عمل نہ تھیں۔ خاندان اور نسل کی وحدت کی بنیاد پر معاشرے بنتے تھے

اور نظام قائم ہوتا تھا۔ علم وثقافت میں چوں کہ عدم وسعت تھی اس لیے اس مذکورہ طریقۂ کار میں اور بھی زیادہ پختگی اور سختی تھی۔

اسلام کے آنے سے قبل یہ اصول رائج تھا کہ یہ دیکھو فلاں تمہارے خاندان کا شخص ہے یا خاندان کے باہر کا۔ یہ لوگ حاکم اور محکوم، آقا غلام، اپنے اور پرائے میں تقسیم تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ معاملہ کرنے میں اسی اصول کو اپناتے تھے۔ حاکم ومحکوم کے خاندان علیحدہ ہوتے، آقام وغلان کا نظام بھی نسل وخاندان کی بنیاد پر قائم تھا۔ جنگ وامن، اپنے اور پرائے کی بنیاد پر چلتا تھا۔ اس طرح ہر خاندان یعنی نسلی رشتہ انسانی وحدتوں کے لیے بنیادی اصول تھا۔ تمام معاملات اسی کے لحاظ سے متعین ہوتے اور چلائے جاتے تھے۔ حق وناحق میں فرق وامتیاز بھی اسی کی بنیاد پر کیا جاتا تھا۔ حکومت وسیادت، پیشے اور کام، قیام اور وطن سب اسی محور کے گرد گردش کرتے تھے۔

اسلام کا کارنامہ

اسلام نے آکر یہ اعلان کیا کہ ''کلکم من آدم لافضل لعربی علی عجمی ولاالعجمی علی عربی الا بالتقویٰ'' (یعنی تم آدم سے ہو، عرب کو عجم پر، عجم کو عرب پر فوقیت نہیں ہے سوائے اس کے کہ تقویٰ کے ذریعہ ہو)۔ اس طرح انسانی تقسیم کا اصول تقویٰ یعنی خوفِ خدا اور صلاح بتایا گیا۔ یعنی نیک اور اچھے لوگوں کی وحدت الگ ہے اور برے لوگوں کی وحدت علیحدہ۔ ان میں سے ایک وحدت کا شخص دوسری وحدت میں شامل ہوسکتا ہے۔ برا آدمی اچھا بن کر اچھے لوگوں کی وحدت میں ضم ہوسکتا ہے۔ اس کے برعکس خاندانی ونسلی بنیاد پر قائم ہونے والی وحدتوں کے درمیان منتقلی نہیں ہوتی ہے۔

مادی بنیاد پر قائم ہونے والی وحدت

دراصل خاندانی وحدت ہو یا دوسری کوئی اور، آج کی رائج وحدت وہ سب جدی یعنی مادی رشتوں پر قائم ہوتی ہے، تعلقات کے لیے مادی بنیاد ہونے کی صورت میں انسان اپنے اور اپنی برادری کے مصالح کو ہی اصول بناتا رہا ہے اور اسی کے لحاظ سے معاملات وفیصلے کرتا ہے، ایک خاندان اپنے کو وابستہ اور دوسرے سے علیحدہ سمجھتا ہے یہ درحقیقت خودغرضی کا نظام ہے جس کو دنیا کے موجودہ ترقی یافتہ عہد کے تمدن نے خاندانی بنیاد کے بجائے فرد کے ذاتی مصالح کی بنیاد پر اختیار کرلیا ہے۔اس میں ہر شخص اس کا لحاظ رکھتا ہے کہ وہ اس کی ذات اور اس کے نقطۂ خیال اور اس کی پسند کے لوگ قابل ترجیح رہیں، اور اس سے تعلق نہ رکھنے والے قابل ترجیح نہ ہو اور یہی بنیاد خودغرضی کی ہے جو قدیم زمانہ میں نسلی ڈھانچہ پر تو کم لیکن متعدد دوسرے ڈھانچوں پر قائم ہوتی ہے جن میں مادی اور خودغرضی کا اصول چلتا ہے۔

خودغرضی

انسانی نظام اجتماع نے اب اگرچہ نئے نئے روپ اختیار کرلیے ہیں اور ان متنوع سکّوں کے باوجود اپنی عالمیت اور ایک وحدت ہونے کا قائل ہے لیکن وہ خودغرضی اور اپنے اور پرائے کے اصول سے باہر نہیں آسکا ہے وہ امن وجنگ، صلح ودشمنی، سیاست واقتصاد نیز دیگر بے شمار مسائل میں یہی اصول اپناتا ہے۔اور اس طرح عالمی برادری کا تصور کامیاب نہیں ہوسکا۔عالمی برادری کا تصور سب سے پہلے حضرت محمد ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر دیا تھا وہ کلکم من آدم و آدم من تراب کے اعلان میں مخفی تھا وہی اصل وحدت انسانی کا ضامن ہے عالمی برادری کی واحد نمائندہ انجمن متحدہ اقوام نے اگرچہ اسی سے ملتا جلتا تصور اپنے چارٹر میں شامل

کیا ہے لیکن وہ انسانی معاشرہ میں جو تفرقہ اور زور وظلم چل رہا ہے اور نسلی وقومی امتیاز کے جو کیریکٹر ہیں ان کو بدل نہیں سکا۔

ذیلی وحدتوں میں کمی میں نئے زمانہ کا اثر

انسانی معاشروں نے اپنے قدیم عہد کے مقابلہ میں اپنے جدید عہد میں اپنی ذیلی وحدتوں کے فرق کو ضرور کر دیا ہے اور وہ یہ کہ انسانوں میں علم وثقافت کے عام ہو جانے کے باعث بہت سی ان صورتوں کو جو بدنمائی کا مظہر تھیں دبا دیا جاتا ہے اور مخفی رکھا جاتا ہے۔ مثلاً اس تصور کا ذکر کیا جاتا ہے اور اس کا حوالہ دیا جاتا ہے کہ سب انسان برابر ہیں خواہ کسی نسل کے ہوں اور کوئی بھی وحدت رکھتے ہوں۔ طبقاتی فرق کو بھی ختم کرنے کا مظاہرہ کیا جاتا ہے اور اس کے لیے مختلف نظریات اختیار کر لیے گئے ہیں ان میں کسی میں اعتدال ہے اور کسی میں سختی ہے۔ لیکن عام طریقہ سے یہ کہا جانے لگا ہے کہ سب انسان برابر ہیں اور اسی کو اصل وطیرہ قرار دیا جاتا ہے۔ اس کا اثر یہ پڑتا ہے کہ خاندانی نظام کے اثر وطاقت میں خاصا فرق آ گیا ہے اور اب خاندانی اور نسل ورنگ کی بنیاد پر جو قومیں سوچتی اور عمل کرتی ہیں ان کو مطعون کیا جاتا ہے۔

مدرسہ

انتظامی بنیاد پر اسلامی معاشرہ میں خاندان کے دائرہ کے ساتھ مدرسہ کا دائرہ شامل ہوا۔ ان دونوں دائروں کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان کا انسانی تربیت سے بہت گہرا اور قریبی تعلق ہے بلکہ انسانی معاشرہ کے تربیتی نظام کے لیے انہی دو دائروں سے بنیادی غذا ملتی ہے۔ اور عام انسانی معاشرے کو بھی اصل تعلیم ان دو سے ہوتی ہے۔ اس لیے تعلیم وتربیت کے مسئلہ میں ان کی بڑی اہمیت ہے۔

مدرسہ تو عہد جدید کا ایک مضبوط اور وسیع نظام ہے جس کو قدیم کے مقابلہ میں غیر معمولی ترقی دی جا چکی ہے اور اس کو معاشرہ کی تعمیر وترقی کے لیے اولین مرکز بنایا گیا ہے۔

خاندانی نظریہ کی کمزوری

نیز خاندان کی طاقت کو انسانی ثقافت وتمدن نے مختلف ذرائع سے کمزور ہے۔ اس کے جو اثرات اور طاقتیں ختم نہیں کی جاسکی ہیں ان کو تسلیم کیا جاتا ہے اور ان سے فائدہ اٹھانے اور ان کے اثرات سے بچنے کی کوشش اور انتظام کیا جاتا ہے۔

بہرحال آج کا انسانی معاشرہ اپنے گونا گوں اختلاف وتنوع کے باوجود نئے ذہن کے لحاظ سے ایک عام وحدت بن گیا ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ ایک انسانی برادری کے اصول پر چلے۔

قومیت کا اثر

لیکن اس انسانی معاشرہ نے قومیت کے اصول کو اپنی بنیاد اور فلسفہ بنایا ہے۔ یہ قومیت ملکوں ملکوں میں اپنے علیحدہ اصول رکھتی ہے جو اس کی وحدتوں کے اصل بنیاد ہوتے ہیں اور آپس کے تعلق وعدم تعلق کی وجہ سے بنتے ہیں۔

اس طرح ہر طرح کی قدیم نسلی وخاندانی بنیاد کی جگہ اب اس نئی بنیاد یعنی قومیت نے لے لی ہے۔

☆☆☆

فقہ و فتاویٰ

حضرت مولانا مفتی احمد صاحب خان پوری دامت برکاتہم

مفت زمین کی خرید وفروخت:

سوال: آج کل ہر گاؤں اور شہر میں گاؤں سے باہر مفت میں زمینیں بسی ہوئی ہیں۔ بعض لوگوں نے اس سرکاری زمین پر بغیر قیمت اور ٹیکس یا کرایے کے مکان بنا کر رہائش اختیار کر لی ہے، تو کچھ لوگوں نے گاؤں میں اپنی ملکیت کا مناسب مکان ہونے کے باوجود یہاں زمین روک رکھی ہے۔ اس جگہ پر نامناسب طریقے سے دباؤ ڈال کر چوطرف پتھر جما کر قبضہ کرنے کے بعد دوسروں کو بیچنا جائز ہے؟ (مطلب یہ ہے کہ سرکاری زمین پر کسی قسم کے استحقاق- ڈوکیومنٹ کے بغیر قبضہ کر کے بیچنا کیسا ہے؟) خریدار بھی سمجھتا ہے کہ اس زمین پر صرف ناجائز قبضہ ہونے کے باوجود میں لے رہا ہوں، تو یہ سودا جائز ہے؟ (یعنی ایسی زمین کے پیسے لینا جائز ہے؟)

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

ایسے قبضے سے وہ مالک نہیں بنا، تو بیچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ شرعاً اسے بیع کہنا درست نہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔

سودا فسخ کرنے کی صورت میں زیادہ رقم لوٹانا:

سوال: میں ایک بلڈر ہوں، اور ۴؍سال قبل ایک مسلمان بھائی کو ۱۰۰؍فٹ جگہ پر تعمیری کام کا وعدہ کیا تھا، فی فٹ ۱۰۰۰؍روپے، اور ۲؍ سے ۳؍سال میں کام مکمل ہو جانے کا وعدہ کیا تھا، لہٰذا اس شخص نے مجھے پورے ۱؍لاکھ روپے دیے۔ نیز یہ بات بھی طے ہوئی تھی کہ اگر کسی وجہ سے جگہ نہ ہو سکے تو ۲۰۰؍فٹ پر سالانہ نفع دیا جائے گا، اس لیے کہ زمین کی قیمت ہر سال بڑھتی

ہے۔اب آج ۴؍سال کے بعد بھی اس زمین پر تعمیر نہیں ہوئی، اور اگلے ۲،۳؍سالوں میں بن بھی سکتی ہے اور نہیں بھی۔ چناں چہ میں آج کی تاریخ کے حساب سے اس بھائی کو اس کے ۱؍لاکھ روپے مزید نفع کے طور پر ۸۰؍ہزار روپے دوں تو جائز ہے یا نہیں؟ اگر نہیں، تو مجھے کیا کرنا چاہئے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

سودا فسخ کرنے کی صورت میں جتنی رقم (۱؍لاکھ) آپ نے خریدار سے وصول کی تھی اتنی ہی رقم اسے لوٹانا ضروری ہے، نفع کے طور پر جو زائد رقم طے ہوئی وہ نفع نہیں، بلکہ سود ہے، جس کا لینا اور دینا دونوں حرام ہے، لینے اور دینے والا دونوں گنہ گار ہیں۔آپ ان بھائی کو بتلائیں کہ ہم نے جو معاملہ طے کیا تھا وہ شریعت کے خلاف تھا، اور اس طرح کی لین دین کرنے سے ہم دونوں گنہ گار ہوں گے۔ وہ مسلمان ہے، لہذا وہ بھی شریعت کے حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کرے گا۔ان شاءاللہ۔فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔

آم کے درخت پر چھوٹے پھلوں کے سودے کا شرعی حکم:

سوال: میں ۵۰؍سال کی عمر کا کسان ہوں، گنّا، کیلے کی فصل ہے، مزید میری ملکیت میں ۳۰؍آم کے درخت ہیں، جو مرحومین بزرگوں کے لگائے ہوئے ہیں۔ کچھ سالوں تک میں بہ ذاتِ خود آم بیچتا تھا، اس وقت ہمت اور طاقت تھی۔ پچھلے چند سالوں سے تیار فصل بیچنے کے لیے دے دیتا ہوں۔ تاجر ابتداء آدھے پیسے دیتے ہیں، بقیہ پیسے آم نکالنے کے بعد دیتے ہیں۔تقریباً ہر سال: نقصان ہو یا نہ ہو، نقصان کا بہانہ بنا کر پیسے کم دیتے تھے، اس کے بعد سے میں سودا کرنے کے ایک دو ہفتے میں ہی پیسے وصول کرنے لگا۔اس میں کسی کی کوئی رعایت نہیں کی۔اب درخت پر پھل آئیں تب سے مطالبے شروع ہوتے ہیں، اور اس میں قیمت زیادہ

حاصل ہوتی ہے۔ درخت رکھنے والے تمام غیر ہوتے ہیں۔ان کو منع کرنے کے باوجود وہ پھل پر ہی سودا کرنے کے مصر ہوتے ہیں، مجھے معلوم ہے کہ وہ مناسب نہیں، البتہ گاؤں کی بہتیری باڑیاں اسی طرح دی جاتی ہیں۔ میرے ساتھ دو تین مسلمان بھی پھل نکل آنے کے بعد دینا چاہتے ہیں، لیکن اس میں تاخیر ہونے کی وجہ سے تاجر دوسری باڑیاں رکھ لیتے ہیں۔ اگر ہم سپردگی میں تاخیر کریں تو قیمت کم بھی مل سکتی ہے یا فروخت بھی نہ ہوں۔اس صورت حال میں بہ ذاتِ خود تجارت کرنی پڑتی ہے اور دوسرے کاروبار میں عدمِ توجہی کی بنا پر اقتصادی نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے۔ مذکورہ تفصیل کے پیشِ نظر مناسب رہنمائی فرمائیں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اگر کچا آم لگنے سے پہلے صرف پھول ہو تو بیچنا بالکل درست نہیں، لہذا اس وقت بیچنے سے بچنا چاہئے۔

چھوٹا پھل آ جانے کے بعد (اتنا چھوٹا کہ انسان یا جانور کے کھانے کے لائق نہ ہو) بیچنے کے سلسلہ میں علماء حنفیہ کے مابین اختلاف ہے، البتہ بعض بڑے علما نے لوگوں کی ضرورت کے پیش نظر اس طریقے پر بیچنا درست اور جائز قرار دیا ہے۔

پھل اتنے بڑے ہو جائیں کہ انسان و جانور کھا سکیں تو متفقہ طور پر ان کا بیچنا جائز اور درست ہے۔ (تکملہ فتح الملہم ۱/۳۹۳،۳۹۴) لہذا کچے پھل کے بعد آپ بیچیں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ نیز کچے آم اچار اور سلاد وغیرہ کے لیے قابل استعمال ہو جاتے ہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔

سونا ادھار بیچنا، ادھار اور نقد کی قیمت میں فرق:

سوال: (۱) میرے پاس ٦/ تولہ سونا ہے، جس کی قیمت ۵۰/ ہزار روپے ہے۔ ایک شخص

مجھ سے وہ سونا ار مہینے کی ادھاری پر مانگ رہا ہے، تو کیا حکم ہے؟

(۲) میرے پاس ۱۰ر تولہ سونا ہے، جس کی قیمت ۵۰ر ہزار روپے چل رہی ہے، میں ایک سنار کو اس شرط پر دوں کہ نقد پچاس ہزار روپے اور ایک مہینے کے بعد ۵۱ر ہزار روپے (ایک مہینے کے بہ جائے ۲ر مہینے کے بعد بھی دے تو وہی قیمت رہے گی) بشرطیکہ وہ خوشی سے دے تو اس طرح تجارت کرنا جائز ہے یا نہیں؟ جواب مرحمت فرمائیں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(۱) اس طرح سونا روپے کے بدلے میں ادھار دے سکتے ہیں۔

(۲) نقد یا ادھار جس طرح وہ خریدنا چاہتا ہے، اس سے پوچھ لیا جائے، اگر وہ کہے کہ ادھار خریدنا ہے تو کہو کہ ایک مہینے کے وعدے پر ۵۱ر ہزار روپے میں دیا، مدت بھی طے کرنا ضروری ہے، تو صفقہ درست ہو جائے گا۔ اور اگر وہ کہے کہ نقد لینا چاہتا ہوں تو آپ کہو کہ ۵۰ر ہزار روپے میں دیا۔ البتہ نقد یا ادھار جس طرح بھی سودا ہو، پہلے سے طے کرنا ضروری ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔

شراب بنانے والے کو گڑ اور پلاسٹک کی تھیلی بیچنا:

سوال: (۱) ایک شخص کی سودا سلف کی دکان ہے، دکان دار سرخ شکر بیچتا ہے، بعض لوگ وہ سرخ شکر شراب بنانے کے لیے خریدتے ہیں، دکان دار کو یہ بات معلوم ہے، اور دوسری دکانوں کے مقابلے میں ایک روپیہ زیادہ ہونے کے باوجود وہ لوگ یہیں سے خریدتے ہیں، اگر انکار کریں تو جھوٹ بولنا پڑتا ہے، اور سرخ شکر نہ دیں تو جھگڑا ہو جاتا ہے۔

(۲) اسی طرح تیل بیچنے کے لیے پلاسٹک کی تھیلی لاتے ہیں، وہ بھی زیادہ قیمت میں خرید کر اس میں شراب بھر کر بیچتے ہیں، دکان دار کو یہ بھی معلوم ہے۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(۱-۲) سرخ شکر پاک وحلال ہے، منفعت کے لیے تیار کی جاتی اور جائز کاموں میں استعمال کی جاتی ہے، اگر کوئی ناجائز طور پر استعمال کرے تو اس کا ذمہ دار وہ ہے، بنانے والا اور تاجر نہیں، لہذا اس کو فروخت کرنا جائز اور اس کی قیمت حلال ہے۔ درمختار وغیرہ کتب معتبرہ میں ہے کہ شیرۂ انگور اس شخص کو بیچنا جائز ہے جو اس کی شراب بناتا ہے، کہ شیرۂ انگور فی نفسہ گناہ نہیں، یعنی انگور کے شیرے میں نشہ نہیں، بلکہ شیرے میں تغیر وتبدل کرنے کے بعد نشہ پیدا ہوتا ہے، اس کا ذمہ دار تغیر وتبدل اور تصرف کرنے والا ہے نہ کہ بیچنے والا، لہذا انگور کے شیرے کی بیع جائز ہے۔ لیکن چوں کہ ظاہراً اعانت علی المعصیۃ کے مثل ہے، لہذا ناجائز استعمال کرنے والے کو بالخصوص مسلمان کو بیچنا خلافِ احتیاط اور خلافِ تقویٰ اور مکروہِ تنزیہی ہے۔ (شامی ۵/۲۴۰، فتاویٰ رحیمیہ ۲/۲۲۱ سے ماخوذ)

نوٹ: مذکورہ بالا دونوں صورتوں میں خریدار سے جو زائد قیمت وصول کی جارہی ہے اس کی وجہ اس کا ان دونوں چیزوں کو سرکاری قانون کے خلاف کاموں میں استعمال کرنا ہے، اور اوپر کے جواب سے معلوم ہو گیا کہ وہ کام شرعاً بھی جائز نہیں، اس بنیاد پر وصول کی جانے والی زائد رقم میں خبث بڑھ جاتا ہے، لہذا اگر جھگڑے سے بچنے کے لیے بیچنے کی ضرورت محسوس ہو تو زائد قیمت وصول کرنا درست نہیں۔

نقص والی نوٹ کم قیمت پر بیچنا

سوال: ۵، ۱۰، ۲۰، ۵۰، ۱۰۰، یا ۵۰۰ / پھٹی ہوئی نوٹ یا تیل سے تر نوٹ دے کر کم رقم لینے کے لیے گاہک تیار ہو جاتے ہیں، اور اس نوٹ کو ہم پوری قیمت میں بیچ دیتے ہیں، بعض نوٹوں کی پوری قیمت نہیں ملتی، تو اس سلسلے میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

یہ بیع شرعاً جائز نہیں، اگر مجبوری ہوتو جواز کی یہ صورت ہوسکتی ہے کہ نوٹ کونوٹ سے تبدیل کرنے کے بہ جائے اس کے عوض کوئی اور چیز خریدی جائے، اس صورت میں بائع اور مشتری مبیع کی جس مقدار پر بھی راضی ہوجائیں، جائز ہے۔غرضیکہ نوٹ کی بیع نوٹ کے بدلے میں ہوتو اس میں کمی بیشی جائز نہیں، کسی دوسری چیز سے ہوتو جائز ہے۔(احسن الفتاویٰ ۷/۲۲)فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔

ادھاراورنقدسودے کی قیمت میں فرق:

سوال: ہم دکان دار جس جگہ سے مال خریدتے ہیں وہاں سے اگر ۱۵/دن کے وعدے پر ادھارخریدیں تو مال کی قیمت پر ۵/روپے زیادہ دینے پڑتے ہیں، اور ایک مہینے کے وعدے پر ۱۰/روپے زیادہ دینے پڑتے ہیں، تو ہم گاہک کو کس طرح مال دیں؟ جس طرح پیسے ادا کیے ہیں اس کے مطابق؟ یا مال کی اصل قیمت کے اعتبار سے؟

سوال: اور ہمارے گاؤں کے دکان داروں کا یہ رواج ہے کہ جسے ادھار دیتے ہیں اس کا حساب ایک روپیہ بڑھا کر لکھتے ہیں، گاہکوں کو یہ معلوم بھی ہوتا ہے، اس سلسلے میں وضاحت فرمائیں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

کسی چیز کو ادھار بیچنے کی صورت میں نقد کے مقابلے میں زیادہ قیمت لگانا درست ہے، البتہ سودا کرتے وقت واضح الفاظ میں خریدار سے کہہ دیا جائے کہ یہ چیز میں اتنی قیمت میں بیچتا ہوں۔فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔

سودا فسخ کرتے وقت پیشگی وصول شدہ رقم فوراً لوٹانا ضروری ہے:

سوال: جولائی ۲۰۰۸ء میں دو فلیٹ کا سودا کیا، بلڈر کو ۹/ لاکھ ایڈوانس دیے گئے، ابھی پلان پاس نہ ہوا تھا، قیمت ۲/ ہزار اسکویر فٹ طے کی۔

نومبر/ دسمبر ۲۰۰۸ء کنسٹرکشن شروع ہوا، جنوری ۲۰۰۹ء کے آخری ہفتے میں بلڈر نے مزید رقم کے لیے فون کیا، اس وقت قیمت ۲۴۰۰/ روپے اسکویر فٹ ہونے کا دعویٰ کیا، باقی پیسوں کا انتظام نہ ہونے کی وجہ سے ۷-۲-۲۰۰۹ کو پیسے کا مطالبہ کرنے پر ۹/ لاکھ ایڈوانس میں سے ۴/ لاکھ سے بھی زیادہ نقصان کے بدلے کاٹنے کو کہا، یعنی صرف آدھی رقم ملے گی۔

(۱) جب کہ بلڈر نے اپنی خوشی اور مرضی سے سودا فسخ کیا تھا، تو کیا وہ نقصان مانگنے کا شرعاً حق دار ہے؟

(۲) اپنا کنسٹرکشن جاری رکھ کر ہمارے ۹/ لاکھ دبا کر رکھنے کا حق دار ہے؟ اس کا خلاصہ فوری طور پر ملنے کے لیے خصوصی درخواست ہے۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(۱) صورتِ مسئولہ میں جب دونوں فریق (بلڈر اور گاہک) نے آپسی رضامندی سے سودا فسخ کر دیا، تو اب بلڈر کے لیے ضروری ہے کہ جو ۹/ لاکھ روپے اس نے وصول کیے، وہ گاہک کو مکمل طور پر واپس کرے، اس میں سے نقصان کے طور پر ایک پائی بھی کم کرنے کا اس کو حق نہیں۔ (بدائع الصنائع ۵/ ۳۵۸-۳۶۱ سے ماخوذ)

(۲) اب جب کہ سودا فسخ ہو چکا ہے، بلڈر کے لیے ضروری ہے کہ پیشگی وصول کردہ رقم ۹/ لاکھ روپے فوری طور پر واپس کرے، تاخیر درست نہیں۔ البتہ اگر پیسے نہ ہونے کی وجہ سے فوری طور پر لوٹانے کی قدرت نہیں رکھتا، تو گاہک کو چاہئے کہ اس کو مناسب مہلت دے، اور بلڈر کو بھی چاہئے کہ گاہک کی یہ رقم ادا کرنے میں ہرگز ٹال مٹول نہ کرے، پہلی فرصت میں اس کی ادائیگی کا انتظام کرے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔ ☆☆☆

قسط سوم

محنت وریاضت

پیر ذوالفقار احمد نقشبندی

مجاہدہ کسے کہتے ہیں؟

یادرکھیں کہ دنیا دارالمجاہدہ ہے اور آخرت دارالمشاہدہ ہے۔ مجاہدہ کسے کہتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ کا حکم پورا کرنے کے لیے اپنے نفس کی مخالفت کرنے، اپنی چاہتوں کو چھوڑنے اور اپنی خواہشات کو قربان کرنے کے لیے بندے کو جو تکلیف اور مشقت اٹھانی پڑتی ہے اسے مجاہدہ کہتے ہیں۔ اسی حقیقت سے پردہ اٹھاتے ہوئے اللہ کے محبوب ﷺ نے ارشاد فرمایا:

المجاهد من جاهد نفسه فی طاعة الله

مجاہدہ وہ ہے جو اپنے نفس کے ساتھ اللہ کا حکم پورا کرنے کے لیے مجاہدہ کرتا ہے۔

نفس کو پالنے والے

نفس کو لگام دینا ایک مستقل کام ہے۔ آج کل تو اکثر لوگ نفس کو لگام دینے کے بجائے نفس کو اس طرح پالتے ہیں جیسے لوگ گھوڑے کو پالتے ہیں۔ یہ بات ذہن نشین کر لیجئے کہ لوگوں سے اپنی تعریف کروانے سے، اپنی تعریف پر خوش ہونے سے، ان کے سامنے اپنے خواب بیان کرنے سے، اپنے درجات اور کیفیات بتانے سے، من پسند کھانا کھانے سے اور دل میں پیدا ہونے والی ہر چاہت کو پورا کرنے سے نفس موٹا ہو جاتا ہے۔ جب یہ نفس اڑیل ٹٹو بن جاتا ہے تو پھر بندہ کہتا ہے کہ اب میرا شریعت پر عمل کرنے کو دل نہیں کرتا۔ اصل میں نفس شریعت پر عمل کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہو رہا ہوتا۔ ایک بزرگ فرمایا کرتے تھے: اے دوست! تو نفس کو

پالنے میں مشغول ہے اور نفس تجھے جہنم میں دھکیلنے میں مشغول ہے۔تو اسے پالے گا اور یہ تجھے کندھے پر اٹھا کر جہنم میں دھکا دے گا۔

اتباع سنت سے نفس مغلوب ہوتا ہے

اس نفس کو کس طریقے سے قابو میں کیا جائے؟

اس کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ ہر کام سنت کے مطابق کیا جائے۔امام ربانی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ لکھا ہے کہ من گھڑت یعنی اپنے بنائے ہوئے نفلی مجاہدے کرنا نفس کے لیے آسان ہوتا ہے لیکن ہر کام سنت کے مطابق کرنا اس پر بڑا بھاری ہوتا ہے۔

۱۹۷۳ء کی بات ہے کہ ایک آدمی اس عاجز کو ملنے آیا۔وہ سولہ سال سے مسلسل روزے رکھ رہا تھا۔میرے دوست بڑے حیران ہوئے کہ یہ سولہ سال سے مسلسل روزے رکھ رہا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ کام اتنا مشکل نہیں ہے۔وہ کہنے لگے کیسے مشکل کام نہیں ہے۔سردی، گرمی، صحت، بیماری، سفر، حضرت میں ہر وقت روزے سے رہنا بہت مشکل ہے۔میں نے کہا: اچھا! اس سے پوچھ لیں۔چناں چہ انہوں نے اس بندے سے پوچھا کہ کیا آپ کو روزہ رکھنے میں کوئی دقّت پیش آتی ہے؟ وہ کہنے لگا نہیں۔پھر وہ مجھے کہنے لگے کہ یہ کیا معاملہ ہے؟ میں نے کہا کہ یہ اس کی عادت بن گئی ہے۔کچھ لوگ دن میں تین دفعہ کھانا کھاتے ہیں اور کچھ لوگ صبح وشام دو دفعہ کھاتے ہیں۔اسی طرح آپ یوں سمجھیں کہ یہ بھی دن میں دو دفعہ کھاتے ہیں۔ایک دفعہ سحری کے وقت اور ایک دفع افطاری کے وقت۔لہٰذا ان کی یہ عادت بن گئی ہے۔میں نے کہا کہ ان سے کہیں کہ جی آپ صوم داودی رکھیں۔یعنی ایک دن روزہ رکھیں اور دوسرے دن ناغہ کریں۔چناں چہ انہوں نے ان سے پوچھا کہ کیا آپ صوم داودی رکھ سکتے ہیں؟ تو انہوں نے کہا نہیں میں ایسا نہیں کرسکتا انہوں نے پوچھا: وہ کیوں؟ وہ کہنے لگے، اس لیے کہ یہ تو میری

عادت بن گئی ہے۔اوردن کے وقت اب میرا کچھ کھانے کو دل ہی نہیں کرتا۔اگر میں ایک دن کھاؤں اور ایک دن روزہ رکھوں تو اس میں میرے نفس پر زیادہ بوجھ ہوگا۔ جو کہ میرے لیے بہت مشکل ہے۔ میں نے کہا دیکھو کہ یہ جو اپنی مرضی سے مجاہدہ کر رہا ہے وہ کام آسان ہے لیکن حدیث میں جو طریقہ آیا ہے اس کے مطابق کام کرنا اس کے لیے بہت مشکل ہے۔

ہمیں چاہئے کہ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر سنتوں پر عمل کریں۔ کھانے کی، پینے کی، سونے، جاگنے کی، اور لباس پہننے کی سنتیں اپنائیں۔ہم نے''باادب بانصیب'' کتاب میں احادیث کی کے ذخیرے میں سے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر ان سنتوں کو درج کیا ہے۔اس لیے جو بندہ چاہے کہ میری زندگی بالکل سنت کے مطابق بن جائے وہ''باادب بانصیب'' کتاب کو پڑھنا شروع کردے اور اپنی ہر عادت کو اس کے مطابق ڈھالتا چلا جائے۔اس طرح اس کی زندگی بالکل سنت کا نمونہ بن جائے گی۔

جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے خوش ہوتے ہیں تو اسے سنت پر عمل کرنا بے ساختگی کے ساتھ نصیب ہو جاتا ہے۔اس کے لیے کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی۔اس کا ہر کام خود بخود سنت کے مطابق ہوتا چلا جاتا ہے۔ایک شخص جنید بغدادیؒ کے پاس نو سال تک رہا۔ایک دن وہ کہنے لگا: حضرت! مجھے اجازت دیں میں کسی اور شیخ کے پاس جاتا ہوں۔انہوں نے پوچھا خیریت تو ہے؟ وہ کہنے لگا حضرت میں نو سال آپ کی خدمت میں رہا اور میں نے آپ کی کوئی کرامت نہیں دیکھی۔حضرت نے فرمایا: آپ مجھے یہ بتائیں کہ ان نو سالوں میں مجھے کوئی کام خلافِ سنت کرتے ہوئے دیکھا ہے؟ وہ کہنے لگا نہیں۔فرمانے لگے، اس سے بڑی اور کیا کرامت ہوسکتی ہے کہ نو سال میں ایک کام بھی نبی علیہ السلام کی سنت کے خلاف نہیں کیا۔۔گویا یہ سب کرامتوں سے بڑی کرامت ہے۔

سنت کی محبوبیت

امام ربانی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر ساری دنیا کی کرامتیں ہم سے چھیں لیں اور اتباع سنت ہمیں دے دیں تو خوش نصیبی کے سوا کچھ نہیں ہے اور اگر ساری دنیا کی کرامتیں دے دیں اور اتباع سنت چھین لیں تو ساری دنیا کی بدبختی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اسی لیے ہماری اکابرین کو اللہ تعالی نے سنت والی زندگی دی۔ ان کا اٹھنا بیٹھنا، بول چار، رفتار گفتار، اور سب طور طریقے سنت کے مطابق تھے۔ نبی علیہ السلام ہر ایک کے لیے سراپا رحمت تھے اور ہمارے اکابرین بھی سراپا رحمت تھے۔ نبی علیہ السلام کا دل دوسروں کی تکلیف پر دکھتا تھا اور ان اللہ والوں کا دل بھی دکھتا ہے۔ نبی علیہ السلام اللہ تعالی کو یاد سے کبھی غافل نہیں رہتے تھے۔ اور ان اللہ والوں کے دل بھی ہر وقت اللہ رب العزت سے واصل رہے ہیں۔ نبی علیہ السلام نے دین کے لیے دن رات ایک کر دیا تھا اللہ والے بھی دین کے لیے ہر وقت اپنی توانائیاں صرف کر رہے ہوتے ہیں۔

تکبیرِ اولیٰ کا اہتمام

ایک مرتبہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم دیوبند کے سالانہ جلسہ میں تشریف لائے۔ آپ نے بیان فرمایا: بیان کے بعد دعا ہوگئی اور ساتھ ہی نماز کے لیے اذان ہوگئی۔ حضرت باوضو تھے۔ آپ اسٹیج سے اٹھے تاکہ نماز کے لیے مسجد میں جائیں۔ آگے سلام کرنے والوں کا اتنا مجمع تھا کہ انہوں نے آپ کو گھیر لیا۔ اب مجمع میں بندہ بعض اوقات ایسا گھر جاتا ہے کہ اسی کو پتہ ہوتا ہے۔ دوسرے کو پتہ نہیں ہوتا۔ بندہ سوچتا ہے کہ اب میں کروں تو کیا کروں۔ اب حضرت چاہتے تھے کہ لوگ ہٹیں اور میں مسجد میں پہنچوں۔ حتی کہ جب مجمع کو ہٹاتے ہوئے بڑی مشکل سے مسجد میں پہنچے تو جماعت کھڑی ہوچکی تھی اور امام نے ایک رکعت

پڑھالی تھی۔حضرت نے جماعت ساتھ نماز پڑھی اور بڑی حسرت کے ساتھ کہا:

''آج تیئیس سال کے بعد تکبیرِ اولیٰ قضا ہوگئی''

اب اس قضا ہونے میں ان کا اپنا کوئی قصور نہیں تھا۔جلسہ گاہ کے ساتھ ہی مسجد تھی وہ وقت سے پہلے نماز کے لیے تیار بھی تھے اور باوضو بھی تھے، جا رہے تھے مگر اللہ کے بندے درمیان میں آ گئے۔وہ جانے ہی نہیں دے رہے تھے۔

اللہ اکبر!تیئیس تیئیس سال تک تکبیرِ اولیٰ کے ساتھ نماز ادا کی۔اصل بات یہ ہے کہ جنہوں نے دنیا میں درجے پائے ہوتے ہیں،انہوں نے مجاہدے کئے ہوتے ہیں۔

حضرت قاری رحیم بخش پانی پتیؒ کا مجاہدہ

اللہ تعالیٰ نے حضرت قاری رحیم بخش پانی پتیؒ کا علمی فیض ایسا پھیلا کہ پورے ملک میں جہاں جائیں ان کے شاگردوں کے مدارس نظر آتے ہیں۔انہوں نے قرآن مجید کی خدمت کے باغ لگائے ہوئے ہیں۔وہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں عمرے پر گیا تو میں جتنے دن بھی حرم شریف میں رہا، میری ہر نماز تکبیرِ اولیٰ کے ساتھ، پہلی صف کے اندر اور امام کے بالکل پیچھے ادا ہوتی تھی۔ہمارے لیے تو یہ ناممکن بات ہے۔ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ہم نے وہاں ایک دن بھی کبھی ایسا نہیں گزرا۔وہاں اتنا مجمع ہوتا ہے کہ ہر نماز پہلی صف میں پڑھنا مشکل ہوتی ہے۔اگر آدمی اس کے لیے آگے جانا بھی چاہے تو نہیں جا سکتا۔پھر ہر نماز پہلی صف میں پڑھنا اور وہ بھی تکبیرِ اولیٰ کے ساتھ اور پھر امام کے پیچھے پڑھنا کتنا دشوار ہوگا۔اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ مسجد میں ہی رہے ہوں گے۔میرا خیال ہے کہ وہ وضو کر کے مسجد میں فجر کی نماز پڑھتے ہوں گے اور عشاء کی نماز پڑھ کر مسجد سے باہر آتے ہوں گے۔اللہ اکبر! جب ہمارے بزرگ ایسے ایسے مجاہدے کرتے تھے تو پھر اللہ رب العزت کی طرف سے انعام بھی پاتے تھے۔

خواجہ سراج الدینؒ کا مجاہدہ

ایک مرتبہ حضرت خواجہ سراج الدین رحمۃ اللہ علیہ حج پر تشریف لے گئے۔آپ عالم تھے جوانی کی عمر تھی۔آپ مکہ مکرمہ میں تیرہ دن رہے اور ان تیرہ دنوں میں نہ کچھ کھایا نہ کچھ پیا۔ ہمارے حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ نہ آپ کو پیشاب آتا تھا اور نہ ہی پاخانہ آتا تھا۔ لوگوں نے پوچھا حضرت! یہ کیا؟ حضرت فرماتے تھے۔

''میں کالا کتا،اس پاک دیس کو کیسے ناپاک کروں۔''

آپ تیرہ دنوں میں حج کر کے وہاں سے مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔ یہ ان کی کرامت تھی۔مگر ایسی کرامت بھی انہی کو ملتی ہے۔جنہوں نے مجاہدہ کئے ہوتے ہیں۔ذرا سوچیں کہ ہم ایک دن میں کتنی مرتبہ بیت الخلاء میں چلے جاتے ہیں۔

مخالفتِ نفس کے مجاہدے

ہمارے بزرگوں نے فرمایا کہ مخالفتِ نفس کے لیے چار مجاہدے ہیں۔

۱۔قلت طعام (تھوڑا کھانا)

۲۔قلت منام (تھوڑا سونا)

۳۔قلت کلام (تھوڑا بولنا)

۴۔قلت اختلاط مع الانام (لوگوں سے میل جول کم رکھنا)

دو مجاہدوں میں چھوٹ

چوں کہ ہم کمزور ہیں اس لیے آج کے دور مین مجاہدے باقی ہیں اور دو مجاہدوں میں چھوٹ دے دی گئی ہے۔قلتِ طعام اور قلتِ منام میں آسانی سے دے دی گئی ہے۔

ہمارے مشائخ نے فرمایا کہ جتنی بھوک ہو اتنا کھالو۔اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

حضرت بہاؤ الدین نقشبند بخاری رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا حضرت! کتنا کھایا کروں؟ انہوں نے فرمایا: اچھا کھا اور کام اچھی طرح کر۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جس بیل کو مالم خوب کھلائے اور وہ بیل کام بھی خوب کرے تو مالک کو خوشی ہوتی ہے۔ اور اس کو کھلانا برا نہیں لگتا۔ ہماری گائیں یہاں دودھ دیتی ہیں تو دل کرتا ہے کہ ان کے منہ میں لقمے ڈالے جائیں۔ اسی طرح جو بندہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتا ہے تو اس بندے کا کھانا اللہ تعالیٰ کو بھی برا نہیں لگتا۔ ہاں جس کا کھایئے اس کے گیت گایئے۔ اللہ کا دیا کھاتے ہیں اور اب اطاعت بھی اسی کی کریں۔

پہلے زمانے کے بزرگ متواتر ایک ایک مہینہ تک پانی کے ساتھ روزے رکھتے تھے۔ اب اتنے مجاہدے کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لیے کہ آج کے دور میں قویٰ پہلے ہی ضعیف ہیں۔ جو اس طرح کے مجاہدے کرے گا وہ تو ہڈی بن جائے گا اور بیماریاں اس پر حملہ کر دیں گی جس کی وجہ سے وہ عبادت کرنے کے قابل بھی نہیں رہے گا۔ آج کے دور میں عبادت بھی وہی کر سکتا ہے جس کے جسم میں طاقت ہے۔ اب میں دو دن بھوکا رہوں تو کیا خیال ہے کہ تیسرے دن میری آواز مجمع تک پہنچ جائے گی؟ نہیں، بلکہ آواز بھی نہیں نکلے گی۔ بلکہ آ......آ......آ...... کر رہا ہوں گا۔

اللہ والے کہتے ہیں کہ ضرورت کے مطابق کھاؤ۔ یہ بھی نہیں کہتے کہ دن میں پانچ مرتبہ کھانا کھاؤ اور یہ بھی نہیں کہتے کہ دن میں صرف ایک لقمہ کھاؤ۔ ہاں! اگر محسوس کریں کہ نفس کے اندر سرکشی زیادہ ہے اور دماغ میں ہر وقت نفسانی، شیطانی اور شہوانی خیالات بھرے رہتے ہیں اور طبیعت پر شہوت کا غلبہ رہتا ہے اور زندگی بھی ایسی ہے کہ نکاح کی صورت حال نہیں۔ تو اب اس کو بھوکا رکھو۔ حدیث پاک میں آیا ہے کہ ایسی صورت حال میں روزے رکھو۔ پھر دو چار روزوں سے کام نہیں بنتا بلکہ ڈٹ کر روزے رکھنے پڑتے ہیں۔ ایک دن روزہ رکھیں اور دوسرے دن

افطار کریں۔ روزے والے دن تو پکا روزہ رہو اور افطار والے دن بھی اتنا کھائیں کہ نام تو افطار کا ہو لیکن حقیقت میں وہ بھی روزے کی طرح ہو۔

جب نفس کو اس طرح لمبے عرصے تک بھوک دی جاتی ہے تو پھر یہ سیدھا ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ یہ سب مستیاں پیٹ بھرے کی مستیاں ہوتی ہیں۔ ایک مرتبہ بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ فاقے کے فضائل بیان کر رہے تھے۔ کسی نے کہا: حضرت! فاقہ بھی کوئی ایسی چیز ہے جس کی فضیلت بیان کی جائے۔ فرمایا: ہاں یہ فضیلت بتانے والی چیز ہے۔ اگر فرعون کو زندگی میں فاقے آئے ہوتے تو وہ کبھی بھی خدائی کا دعویٰ نہ کرتا۔ وہ تو بادشاہ تھا اسے فاقے کا کیا پتہ۔ انگریزوں میں مشہور ہے کہ کسی ملک کے لوگوں نے مہنگائی اور بھوگ کے خلاف ہڑتال کی اور جلوس نکالا۔ بادشاہ اور اس کی ملکہ دونوں نے جلوس دیکھا۔ ملکہ نے بادشاہ سے پوچھا کہ لوگ نعرے کیوں لگا رہے ہیں؟ اس نے کہا کہ یہ اس لیے نعرے لگا رہے ہیں کہ روٹی کھانے کو نہیں ملتی۔ وہ کہنے لگی۔ اچھا! اگر روٹی نہیں تو ملتی تو ان سے کہیں کہ وہ ڈبل روٹی کھا لیا کریں۔ اس بے چاری کی زندگی محل میں گزری تھی۔ اسے کیا پتہ کہ بھوک کیا چیز ہوتی ہے۔

عورتوں نے خدائی کا دعویٰ کیوں نہ کیا

ایک نکتے کی بات سنئے! جو بندہ اپنے آپ کو دوسروں سے چھوٹا سمجھے وہ کبھی خدائی کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ یہ پکی بات ہے کہ خدائی کا دعویٰ وہی کرے گا جو اپنے آپ کو بڑا سمجھے گا۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ انسانیت میں کبھی بھی کسی عورت نے خدائی کا دعویٰ نہیں کیا۔ اس لیے کہ عورت اپنے آپ کو ہمیشہ مرد کے ماتحت سمجھتی ہے اور مرد کو اپنے آپ پر فوقیت دیتی ہے۔ چوں کہ اس کے ذہن میں ہوتا کہ کوئی نہ کوئی مرد میرا بڑا ہے۔ مثلاً یہ میرا باپ ہے۔ یہ میرا خاوند ہے۔ یہ میرا بھائی ہے۔ لہذا کبھی کسی عورت نے خدائی کا دعویٰ نہیں کیا۔

زیادہ کھانے کی قباحت

احادیث میں کم کھانے کے فضائل اور زیادہ کھانے کی قباحت بیان کی گئی ہے۔ نبی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ ''تفکر کرنا نصف عبادت ہے اور کم کھانا پوری عبادت ہے۔''

ایک اور جگہ پر فرمایا: کہ ''اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ افضل وہ ہے جو بہت تفکر کرے اور بہت بھوکا رہے اور اللہ کا سب سے بڑا دشمن وہ ہے جو بہت کھائے پیئے اور بہت زیادہ سوئے۔'' یہ بھی فرمایا کہ ''جو شخص پیٹ بھر لیتا ہے اسے آسمان کی بلندی کی طرف راستہ نصیب نہیں ہوتا'' بلکہ یہاں تک فرما دیا کہ زیادہ کھا پی کر اپنے دل کو مردہ نہ بناؤ اس لیے کہ دل کھیت کی مانند ہے اور زیادہ پانی سے بھی کھیت مرجھا جاتا ہے۔ ان احادیث مبارکہ سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں کم کھانا زیادہ پسندیدہ ہے مگر اس کے باوجود کچھ لوگ بسیار خوری کے اتنے عادی ہوتے ہیں کہ خدا کی پناہ۔

☆☆☆

خبرنامہ

مغربی بنگال میں ۵؍ پولیس افسران معطل، IPS افسر بھی شامل

الیکشن کمیشن کا بڑا ایکشن، جانب داری کے الزامات پر کارروائی

کولکاتہ(ایجنسی)الیکشن کمیشن آف انڈیا نے مغربی بنگال کے جنوبی ۲۴؍ پرگنہ ضلع میں انتخابی ڈیوٹی کے دوران مبینہ جانبداری اور سنگین بدانتظامی کے الزامات پر پانچ پولیس افسران کو معطل کردیا ہے، جن میں ایک آئی پی ایس افسر بھی شامل ہے۔ یہ اقدام ایسے وقت میں کیا گیا ہے، جب ریاست میں دوسرے مرحلے کی پولنگ محض چند دن دور ہے۔ معطل کیے گئے افسران میں ایڈیشنل سپرنٹنڈنٹ آف پولیس، سب ڈویژنل پولیس افسر، اور متعدد تھانوں کے انچارج شامل ہیں، جو ڈائمنڈ ہاربر اور ملحقہ حساس علاقوں میں انتخابی فرائض انجام دے رہے تھے۔ کمیشن کے مطابق، ان افسران پر الزام ہے کہ انہوں نے انتخابی ڈیوٹی کے دوران غیر جانبداری برقرار نہیں رکھی اور بار بار تنبیہ کے باوجود ان کے رویے میں بہتری نہیں آئی۔ ڈائمنڈ ہاربر حلقہ، جہاں سے ترنمول کانگریس کے رہنما ابھیشک بنرجی رکن پارلیمنٹ ہیں، اس پورے معاملے کا مرکز رہا ہے۔ الیکشن کمیشن نے یہ بھی واضح کیا کہ ایک سینئر افسر ڈائمنڈ ہاربر کی ایس پی کو اپنے ماتحت افسران پر کنٹرول نہ رکھنے کے باعث ’’وارننگ‘‘ دی گئی ہے۔ کمیشن نے ریاستی چیف سکریٹری کو ہدایت دی ہے کہ تمام معطل افسران کے خلاف فوری طور پر کارروائی شروع کی جائے اور تعمیل رپورٹ پیش کی جائے۔ ذرائع کے مطابق کمیشن نے ایک آئی پی ایس افسر کے معاملے کو مرکزی وزارت داخلہ کو بھی بھیج دیا ہے، کیوں کہ یہ ملک گیر سروس قواعد سے متعلق معاملہ ہے۔ اس سے قبل بھی ایک اور پولیس افسر کو اسی نوعیت کے الزامات پر معطل کیا جاچکا ہے، جس سے انتخابی ماحول مزید حساس ہوگیا ہے۔ دوسری جانب ریاستی حکومت اور ممتا بنرجی کی قیادت والی ترنمول کانگریس (TMC) نے الیکشن کے اقدامات پر سخت اعتراض کیا ہے۔ پارٹی کا موقف ہے کہ افسران کے اچانک تبادلے اور معطلیاں انتظامی نظام کو متاثر کررہی ہیں۔ وزیر اعلیٰ ممتا بنرجی نے چیف الیکشن کمشنر کو متعدد خطوط لکھ کر شکایت کی ہے کہ ایسے اقدامات بغیر ریاستی حکومت کو اعتماد میں لیے بغیر کیے جارہے ہیں، جس سے انتظامی توازن متاثر ہورہا ہے۔ یہ صورت حال مغربی بنگال میں انتخابات کے دوران کمیشن اور ریاستی حکومت کے درمیان بڑھتی کشیدگی کو مزید نمایاں کررہی ہے۔ جہاں سیاسی درجہ حرارت پہلے ہی بلند ہے۔

(بشکریہ روزنامہ اردو ٹائمز ممبئی ۲۶؍ اپریل ۲۰۲۶ء)